چاندی کے تار
مہندر ناتھ
مکتبۂ اردو لاہور

چاندی کے تار

مہندر ناتھ

مکتبہ اردو لاہور

قیمت عہ ۱۲/

چوہدری نذیر احمد کے اہتمام سے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپ کر مکتبہ اردو لاہور سے شائع ہوئی

فہرس

تعارف ۷
تاریکی اور روشنی ۱۷
طوفان کے بعد ۲۵
خلا ۵۳
ریاضت ۶۹
چھ بجکر بیس منٹ پر ۸۵

دو بیل ۹۹
بغاوت ۱۱۵
حنائی انگلیاں ۱۲۹
ہاتھ کا بڑھنا ۱۴۵
چاندی کے تار ۱۶۵
اکیلا ۱۹۳
برف ۲۲۳

عسکری کے نام ——

دو بیل ۹۹
بغاوت ۱۱۵
حنائی انگلیاں ۱۲۹
ہاتھ کا بڑھنا ۱۴۵
چاندی کے تار ۱۶۵
اکیلا ۱۹۳
برف ۲۲۳

عسکری کے نام ——
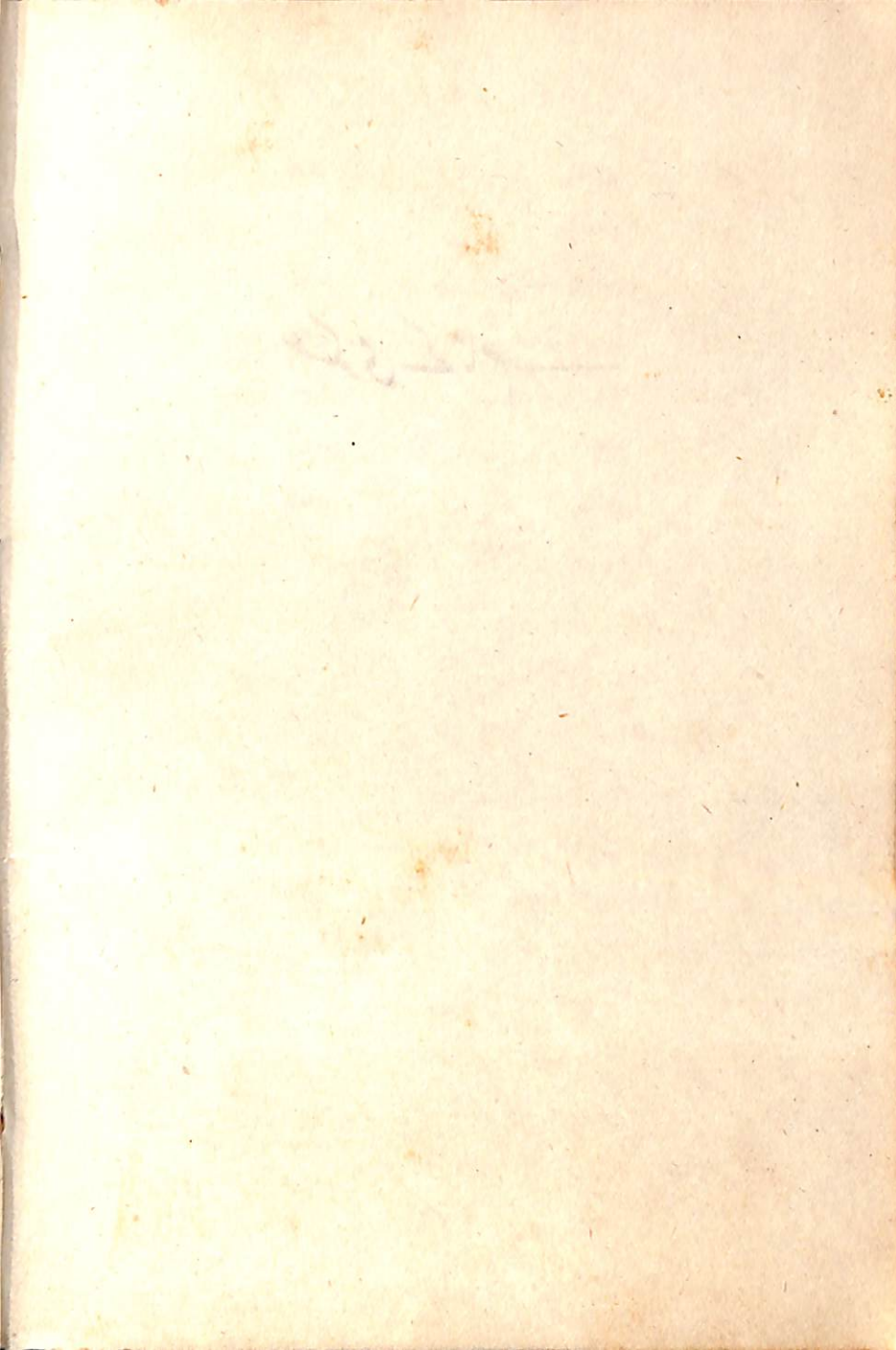
تعارف

"یہ افسانے آپ کو پسند ہیں؟"

"ہاں مجھے تو پسند ہیں، اور آپ کو؟"

"مجھے پسند نہیں ہیں۔"

اگر تنقید، تبصرہ یا رائے زنی کی منزل یہیں ختم ہو جایا کرتی تو میں بھی اتنا کہہ کر خاموشی اختیار کر لیتا کہ مہندر ناتھ کے افسانے مجھے پسند ہیں لیکن خوش قسمتی یا بد قسمتی سے ہم ایک ایسے دور میں ہیں جس میں ہر بات کا سبب دریافت کیا جاتا ہے، کسی چیز کو اچھا یا بُرا کہنے کی وجہ پوچھی جاتی ہے اور اگر کوئی نہ پوچھے تو بھی کہنے والے کو اس دورِ عقل و معقولات میں زمانہ کی عام روش کا خیال رکھنا پڑتا ہے انفرادی ذوق کے نقطۂ نظر سے ادب کے ساتھ یہ عملِ جرّاحی مناسب نہیں معلوم

ہوتا لیکن ادب کو اس کے جماعتی رشتہ میں سمجھنے کے لئے کوئی معیار ضرور قائم کرنا پڑے گا، کسی نہ کسی طرح ایک عمومی رائے بنانی پڑے گی جو بالقصد لکھے ہوئے افسانوں کے سمجھنے اور پرکھنے میں مدد دے۔ خاموش پسندیدگی سے آگے بڑھکر تنقید اور تجزیہ کی منزل ہے۔

جدید اُردو افسانوں کی عمر ابھی چھوٹی ہے اور مہندر ناتھ کے افسانوں کی عمر تو بہت ہی کم ہے لیکن ان کے اندر اُن کے پیشروؤں کی پیدا کی ہوئی پختگی، اُن کی بسائی ہوئی خوشبوئیں، اُن کی لائی ہوئی لطافتیں جمع کرنے کی کوشش ضرور معلوم ہوتی ہے۔ مہندر ناتھ کی افسانہ نویسی کا دور چند مشہور افسانہ نگاروں کا دور ہے جنہوں نے فن اور مواد دونوں کی حیثیت سے افسانہ نویسی کو پریم چند سے آگے بڑھایا ہے اور ایسی ہی جگہ پر پہنچکر ایک ہونہار اور ترقی کرنے والے افسانہ نگار کے جوہر کھلتے ہیں، اُس کی پرواز کا حال معلوم ہوتا ہے۔ مہندر کے لئے یہ کشمکش بہت سخت تھی کہ جب افسانہ نویسی ترقی کی اس رفتار سے چل رہی ہے تو اُن کا کیا راستہ ہونا چاہیئے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ تقلید کی راہ سے ہٹکر مہندر نے کردار نگاری کی ایک مخصوص جھلک دکھائی ہے۔ انہوں نے اپنے لئے وہ دنیا منتخب کر لی جس کے بارے میں انہیں اچھی طرح علم تھا۔ ہندوستان کا متوسط طبقہ اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے اپنے اندر بڑی متضاد کیفیتیں رکھتا ہے، وہ آگ بھی ہے پانی بھی، وہ برف بھی ہے شعلہ بھی، وہ روایت پرست بھی ہے روایت شکن بھی، وہ آگے بھی بڑھ رہا ہے پیچھے بھی ہٹ رہا ہے، وہ فضا میں معلّق ہے، اوپر بھی جا سکتا ہے، نیچے بھی گر سکتا ہے۔ ایسا اہم طبقہ

نہ صرف انفرادی حیثیت سے بلکہ اجتماعی حیثیت سے افسانہ کا کردار بننے کی بڑی صلاحیت رکھتا ہے لیکن افسانہ نگار کے ہاتھ اگر اس سیّال مواد کو کہانی کے سانچے میں ڈھالنے کی قدرت نہیں رکھتے تو افسانہ ایک معمّہ بن جائے گا اور افسانہ ہو یا نظم موضوع اُسی وقت معمّہ بنتا ہے جب لکھنے والے کو اپنے موضوع کا پورا علم نہ ہو لیکن مہندرناتھ نے متوسط طبقہ کی خواہشوں اور اُمنگوں، فریب کاریوں اور دشواریوں کو خوب سمجھا ہے اور اُس تضاد کو بھی سمجھا ہے جو انہیں سب سے زیادہ متحرک بنائے ہوئے ہے۔

متوسط طبقہ میں سب سے بڑی کشمکش آج پیدا ہوئی ہے جب زندگی کے تمام اداروں کی جانچ پڑتال نئے سرے سے شروع ہوئی ہے، خانگی زندگی، جنسی معاملات، تعلیم، شادی بیاہ، مفلسی، حقیقت اور خیال کی جنگ، سوتے جاگتے خواب، بہتر زندگی کا خواب، انسانی مساوات کا خواب، صحت اور حُسن کا خواب، آزادی اور عزت کا خواب، ان خوابوں کی تعبیر، ان مسائل سے جوانوں کے دماغ لبریز ہوتے ہیں، وہ مشکلوں کو حل کرنا اور گتھیوں کو سلجھانا چاہتے ہیں، وہ زندگی کو نچوڑ کر اس سے زیادہ سے زیادہ حاصل کرنا چاہتے ہیں اور جب انھیں رکاوٹیں پڑتی ہیں تو وہ اجتماعی اور انفرادی بغاوتوں کے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ چونکہ معاشی نظام بدل ہی نہیں رہا ہے اس لئے خواب خواب ہی رہ جاتے ہیں مہندرناتھ کے افسانوں میں یہ ساری کشمکش زندہ اور متحرک دکھائی دیتی ہے عمل ہے، پسپائی ہے، شکستیں ہیں، سپنے ہیں، محبت اور نفرت ہے۔ یہ تمام باتیں مہندرناتھ نے بے باک کردارنگاری کی مدد سے انجام دی ہیں

حقیقت اور طنز کے میل سے واقعات پر تیز روشنی پڑتی ہے اور نئی حقیقت نگاری جنم لیتی ہے۔

"لیکن امانت ——— امانت ہی ہوتی ہے، اگر کپلا چچی کی امانت ہے تو میری بھی امانت ہے۔ اس میں خیانت کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو کون ذمہ دار ہوگا چچی منہ دکھانے کے قابل نہ رہے گی۔ شادی کرنے سے تو ہیں رہا۔ یہ تو کپلا بھی جانتی ہے کہ وہ مجھ سے شادی نہیں کر سکتی وہ میری چچی کی رشتہ دار ہے اور میں اُس کی چچی کا رشتہ دار ——— درمیان میں چچی حائل ہے۔ چین کی دیوار کی طرح، ان گنت صدیوں کا تعصب اور جہالت راستہ روکے کھڑی ہے۔ اس ماحول سے نکلنا مشکل ہے چاہے امنگیں کچلی جائیں۔ خواہشیں مردہ ہو جائیں عورتیں جوانی میں بوڑھی ہو جائیں لیکن چین کی دیوار قائم ہے اور قائم رہے گی۔" (تاریکی اور روشنی)

حقیقت اور طنز اگر یہ دونوں نہ ملتے تو چچی صرف کپلا کی چچی رہ جاتی ایک مثال نہ بنتی۔ متوسط طبقہ کا تضاد نمایاں نہ ہوتا اور کردار نگاری مکمل نہ ہوتی۔ حقیقت ایک بہت ہی مرکب اور پیچیدہ چیز ہے۔ بعض لوگ غلطی سے صرف خارجی منظر نگاری اور خارجی بیان کو حقیقت سمجھ لیتے ہیں، بعض لوگ جذبات کو پیچیدہ طور پر بیان کر دینے ہی کو حقیقت نگاری کہتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ حقیقت میں دونوں کی آمیزش ہوتی ہے، خارجی اور داخلی طور پر

کردار کی پیچیدگی کو سمجھنا اور سمجھانا کردار نگاری اور اثر آفرینی کا راز ہے۔ اسی اظہار بیان سے ملی ہوئی تجزیہ کی منزل ہے اور مہندر ناتھ تجزیہ کرتے نہیں تھکتے اس لئے اُنکے افسانوں کے بعض حصّے اثر کا خزانہ بن جاتے ہیں مسکراہٹ کا تجزیہ بالکل ایک ڈاکٹر کی طرح جو ایک مرض کو دوسرے مرض سے تشخیص کر لیتا ہے "اُن داخلی اور خارجی عناصر سے مل کر بنتا ہے جن سے حقیقت نگاری میں جان پڑتی ہے۔

"ہم ایک مشینی دور سے گذر رہے ہیں۔ ہم اس زمانے میں پیدا ہوئے جب پانی اور ہوا پہ انسان نے قابو پالیا ہے۔ ہم وقت رفتار اور فاصلے پہ حاوی ہو چکے ہیں۔ اب روحانی باتوں کا زمانہ نہیں۔ بالکل مادی چیزوں کا تذکرہ ہوتا ہے اور اسلیے مسکراہٹیں بھی مادی ہو گئی ہیں اور جب میری طرف کوئی مسکرا کر دیکھتا ہے تو سوچنے لگتا ہوں کہ اس مسکراہٹ کا کیا مطلب ہے"

(چاندی کے تار)

اور پھر اسی افسانے میں ایک اور لطیف تجزیہ!

"ایک جوتشی نے چند دن گذرے مجھے بتایا کہ میں جلد مر جاؤں گا۔ میں جوتشی کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا، برسوں سے جھوٹ بولنے سے اسکے خدوخال مسخ ہو گئے تھے، چہرے پہ ایک قسم کی نحوست برس رہی تھی اور اس پتھریلی سڑک پر بیٹھے ہوئے نہ جانے اُسے کتنے برس ہو گئے تھے اور کون جانتا ہے اس

نے کتنوں کے ہاتھ دیکھے اور اُن کی قسمت کا جائزہ لیا......
لیکن سڑک پر گذرنے والوں نے کبھی یہ نہ سوچا کہ وہ کیوں بیس سال سے اس خاک آلود سڑک پر بیٹھا ہُوا ہے جہاں گندگی اور غلاظت کے انبار لگے ہوئے ہیں اور پیشاب کی بُو سے پھیپھڑے جُھلس جاتے ہیں۔ کیا ان بیس سال میں اس کی قسمت کا ستارہ کبھی بلند نہ ہُوا۔ کیا وہ ترکیبیں، تجویزیں جو وہ دوسروں کو بتاتا تھا کبھی اُس نے اپنے اوپر نہیں آزمائیں۔ کیوں یہ پتھریلی زمین اس کی بنجر زندگی کا ایک اہم جزو بن گئی۔ کیا یہ سڑک یوں ہی پتھریلی رہے گی اور اس پر چلنے والوں کا ستارہ کبھی بلند نہ ہوگا میں نے چاہا کہ اس جوتشی کو کھری کھری سناؤں اور اُس سے کہہ دوں کہ وہ کیوں جھوٹ بول کر اپنی روح کو گندہ ہونے دیتا رہا ہے لیکن زندگی میں صرف روح ہی ہوتی تو میں اس سے یہ بات پوچھ لیتا۔ لیکن زندگی میں روح کے علاوہ پیٹ بھی ہے جو روح سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ روحانی تسلّی کو خیر باد کہا جا سکتا ہے لیکن پیٹ کی بھوک کو خیر باد کہنا مشکل ہے"!

ایسا تجزیہ جس میں داخلیت اور خارجیت اس طرح مل جائیں مکمل نقش بناتا ہے۔ یہ وہ خوبی ہے جس کا ذکر میں خاص طور سے اس لئے کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے نئے افسانہ نگار جب تک زندگی کی اس پیچیدگی کو نہ سمجھیں گے وہ یا تو فنّی حیثیت سے اس کمزوری کا اظہار اس طرح کریں گے کہ افسانہ

پروپیگنڈے کی سرحد سے مل جائے گا یا پھر صرف جذباتی اور تخیلی ہو کر بے مقصد ہو جائے گا اور دونوں صورتیں کامیاب افسانہ نگاری کے لئے تباہ کن ہیں۔ تجزیہ میں ایک طرح کا اشارہ اپنے مقصد کی طرف ہونا چاہئیے۔ تنقید ہونی چاہیئے، امرت اور زہر جو کچھ بھی پیش کرنا ہے اسی کے اندر سمویا ہوا ہونا چاہیئے یعنی حیات کی راہیں جتنی پیچیدہ ہیں اتنی ہی پیچیدگی افسانہ میں بھی ہو لیکن اُس کا اظہار پیچیدہ نہ ہو۔ شہ پا پڑھی لکھی لڑکی ہے ایک جگہ کالج کے لڑکوں کا تجزیہ کرتی ہے۔

"یہ کالج کے لڑکے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ ان کا عشق بھی نرالا۔ برسوں کی غلامی نے اُن کے عشق کو بے زبان کر دیا ہے۔ یونہی ہمیشہ لڑکیوں کی طرف

> آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھیں گے نہ منہ سے بولیں گے نہ سر سے کھیلیں گے۔ بہت ہوا تو کسی سے کندھا بھڑا دیں گے، کسی کو سنا دیکر واہیات سا مذاق کر دیں گے یا کبھی کسی لڑکی کے سامنے سے گذرتے ہوئے کھانس دیں گے۔ یہ سب حرکات اُن گونگے انسانوں کی طرح کی جاتی ہیں جن کی زبان سی دی گئی ہو۔ جن کی ذہنی قوتیں برسوں کی غلامی سے کند ہو گئی ہوں اور جن کی زندگیاں بے لذت اور تلخ ہو گئی ہوں اونہہ! گونگے عاشق۔۔۔۔"

(ضلاع)

حقیقت شعور و لاشعور دونوں سے مرکب ہے۔ "بغاوت" میں چندا بڑی بہن کا حال سُنکر بڑی تیزی سے زندگی کی ایک منزل سے دوسری منزل میں پہنچ

جاتی ہے اس کا اثر بڑی ڈرامائی کیفیت پیدا کرتا ہے۔" ہاتھ کا بڑھنا" میں رتنی کی آنکھیں پوری داستان کہتی ہیں جسے وہ سمجھ سکتا ہے جس کی روح رتنی کی آنکھوں میں در آتی ہے۔

مہندر ناتھ کے افسانوں کی اصل خوبی یہی ہے جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے اس کے بہت سے نمونے ان افسانوں میں ملتے ہیں غالباً یہی وجہ ہے کہ جب وہ افسانہ کسی پلاٹ کو سامنے رکھ کر لکھتے ہیں اور باقاعدہ مکالمہ کے ذریعہ سے کرداروں کے خدوخال پیش کرتے ہیں تو پڑھنے والے پر اتنا اثر نہیں پڑتا لیکن جب کوئی پلاٹ نہیں ہوتا بلکہ صرف زندگی کا پیچ در پیچ خاکہ ہوتا ہے تو مکالمہ ہی افسانے کی جان بن جاتا ہے۔ اس حیثیت سے "حنائی انگلیاں" ایک کامیاب تجربہ ہے۔

یہ تو میں کہہ چکا ہوں کہ مہندر ناتھ کے افسانوں کا پس منظر متوسط طبقہ ہے۔ یہ زمین بڑی زرخیز ہے، اس کے بسنے والوں میں بہت تنوع ہے، اس میں ہر طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں جن کی گفتار اور کردار میں ہندوستانی زندگی کا پورا بہاؤ دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں کی معاشرتی اور اقتصادی حالت، سیاسی غلامی، جنسی فضا سب پر پردہ سا پڑا ہوا ہے جسے اس طبقہ کے لوگوں نے ڈال رکھا ہے جس کا نام تہذیب رکھ دیا ہے جس سے حقیقتیں چھپ جاتی ہیں لیکن تیز نگاہیں اس کے باہر اور اندر بھی دیکھتی ہیں وہاں ایک اور دنیا ہے۔ اس کے لئے شاید ہم ٹھوس کے ساتھ کہہ سکیں۔

"موسم کتنا خوشگوار ہے ہوا کیسی ٹھنڈی اور سکون بخش ہے۔ پھولوں میں کتنی تازگی ہے اور ہرے ہرے پتوں میں کتنی چمک ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر طرف بہار کی دُلہن اپنے ہاتھوں سے حسن بکھیر رہی ہے یہ لانبے لانبے درخت، یہ خوبصورت اور حسین پرندے، یہ پھیلا ہوا نیلا آسمان، یہ سورج کی کرنیں، یہ سب حُسن کس کے لئے ہے آؤ ہم ہی اس سے محبت کریں۔"

(اخلاق)

یہ محبت کے لائق دنیا ہماری موجودہ دنیا میں کہیں چھپی بیٹھی ہے اور اُس وقت نکل سکتی ہے جب ہم اس پرانی دنیا سے نفرت کر کے اُس نئی دنیا کے لئے اپنے دل میں جگہ بنا لیں —— جب تک یہ پُرانی دنیا ہے پریشانی ہو گی چاہے ہم پریشانی کا سبب سمجھ سکیں یا نہ سمجھ سکیں۔

"میں اکثر سوچتا رہتا ہوں کہ میں کیا چاہتا ہوں میں کیوں پریشان ہوں اور آہستہ آہستہ مجھ پر یہ بات آشکارا ہونے لگی کہ مجھے کلرکی سے نفرت ہے۔ مجھے ان ساٹھ روپوں سے نفرت ہے، مجھے ان بچوں سے نفرت ہے، مجھے اس گھٹے ہوئے ماحول سے نفرت ہے مجھے ان چھوٹے چھوٹے مکانوں سے نفرت ہے، مجھے انسانوں کی کمینگی سے نفرت ہے یہ کیوں ہر طرف غلاظت ہی غلاظت نظر آتی ہے، کیوں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہوتا ہے جھونپڑوں پر اندھیرا، برتنوں پر اندھیرا، چولہے پر اندھیرا، روٹیوں پر اندھیرا، اور آہستہ آہستہ یہ اندھیرا پھیلتا جاتا ہے، کائنات کے ذرّے ذرّے پر چھائے جاتا ہے، انسان کے ریشے ریشے میں سمائے

جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ مجھے اس نظام سے نفرت ہونے لگی جہاں
اس قسم کا اندھیرا پھیلا رہتا ہے۔ کیوں نہ میں اس اندھیرے کو چیر
دوں، اس اندھیرے کی قبا کو پھاڑ دوں تاکہ روشنی کا منبع اعظم
پھوٹ پڑے، کم از کم ان چھوٹے مکانوں میں روشنی تو آجائے"!
(چاندی کے تار)

جب افسانہ نگار اور ادیب فکر کی اس منزل سے گذرتا ہے تو اُس کے یہاں مواد
اور ہیئت دونوں سے مل کر خوبصورت افسانے بُنے جاتے ہیں اور یہ بات قابل
اطمینان ہے کہ مہندر ناتھ نے اپنے افسانوں کی بنیاد ٹھوس مواد پر رکھی ہے
اور صرف جوانی کے ہیجان سے متاثر ہو کر کہانیاں نہیں کہی ہیں۔

لکھنؤ
۳ جولائی ۴۳ء

احتشام حسین

تاریکی اور روشنی

ایک لمحہ کے لئے کپلا کی آنکھوں میں بجلی کوندگئی۔ اور پھر آن واحد میں غائب ہوگئی۔ مجھے ایسا معلوم ہؤا کہ کسی بھٹکے ہوئے راہی نے مشعل دکھائی۔ یکایک راستہ روشنی سے منور ہوگیا۔ صرف ایک ثانیے کے لئے۔ اور پھر مکمل اندھیرا ——— تاریکی ——— اندھیرا۔

جب کپلا کے گھر والوں نے کپلا کو ہمارے گھر بھیجا تھا۔ انہیں اس بات کا پورا بھروسہ تھا کہ کپلا کا ہر لحاظ سے خیال رکھا جائے گا۔ اور پرچی تو خود بھی ایک جہاندیدہ عورت تھی۔ جس نے دنیا کے نشیب و فراز دیکھے تھے۔ وہ اس نئی تہذیب کی بدعنوانیوں کو اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ ہر ممکن طریق سے اپنے

بچوں کو اس نئی تہذیب کو اپنانے سے روکتی۔ لیکن مغربی تہذیب کی رو کچھ اس سرعت سے آ رہی تھی کہ اکیلی چچی اسے روکنے سے قاصر تھی۔ لیکن چچی کی تیز نگاہیں گھر کے ہر فرد پر پڑتیں۔ انہیں ٹٹولتیں۔ انہیں جاننے کی کوشش کرتیں اور کبھی کبھی تنبیہہ کر کے واپس آجاتیں۔ لیکن نئی تہذیب پوری قوت کے ساتھ بڑھ رہی تھی۔ کپلا کے لئے یہ ماحول نیا تھا۔ وہ اُس گھر میں پلی تھی۔ جہاں آزادی زیادہ ہوتی ہے اور پیار حد سے بڑھ جاتا ہے اور بچے کا ہر ناز نخرہ برداشت کر لیا جاتا ہے۔

لیکن یہاں کچھ اور ہی بات تھی۔ یہاں نہ نوکر تھے نہ نوکرانیاں۔ بس دو چھوٹے سے کمرے۔

یہاں، نہ ڈرائنگ روم تھا۔ نہ سونے کا کمرہ۔ نہ کھانے کا الگ کمرہ۔ کمروں میں نہ رنگین پردے تھے نہ سوفہ سیٹ، یہی دو کرسیاں تھیں۔ اور ایک بڑی چٹائی، جو اکثر فرش پر بچھی رہتی تھی، ایک کونے میں ایک میز پڑی ہوتی تھی۔ جس پر گھر کے مختلف افراد کی چیزیں پڑی رہتی تھیں۔ کسی کی دوات ہے تو کسی کا رومال، کسی کا کنگھا ہے تو کسی کا گرد و غبار سے اٹا ہوا ہیٹ۔ میز پوش نہایت ہی میلا اور گندا ہوتا تھا جس پر لاتعداد سیاہی کے دھبّے ہوتے تھے اگرچہ ہر طریقہ سے کمرے کی صفائی کا خیال رکھا جاتا تھا۔ لیکن اس صفائی کے باوجود کمرے محض کباڑ خانے معلوم ہوتے تھے۔ گرمیوں کے دنوں میں مکھیوں کی فوجیں کمروں میں گشت کرتیں۔ اور کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ کمرے انہی مکھیوں کی رہائش کے لئے بنے ہیں۔ کھانا کھاتے

کے ذہنِ لڑکیاں تماشائیوں کے ارد گرد منڈلاتیں، اور اکثر نوالوں کے ساتھ اندر جانے کی کوشش کرتیں۔ پھر کپیلا کے لئے کوئی ایسا مشغلہ نہ تھا۔ جس سے وہ اس گھر میں خوش رہ سکتی۔ اگر اُسے کسی بات کی تسکین تھی۔ تو یہ کہ وہ لاہور میں رہی ہے۔ لاہور کا تصور کتنا خواب ناک ہوتا ہے۔ اس کے متعلق وہ لڑکے یا لڑکیاں بتا سکتے ہیں۔ جو لاہور میں سکونت پذیر ہیں، یا لاہور جانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ لاہور نے رومان کے لئے ایک خاص جگہ پیدا کر لی ہے۔

اور کپیلا اُن لڑکیوں میں سے تھی۔ جن کے دل و دماغ میں لاہور کی رنگین فضائیں بسی ہوئی تھیں۔ یوں ہی مَن ہی مَن میں کپیلا اپنے آپ کو نئی فضا میں پاتی۔ خوابوں سے اپنے دماغ کو معمور کر لیتی۔ وہ لاہور کو جی بھر کر دیکھنا چاہتی تھی۔ اُس کے ہر کونے، ہر بازار، ہر ہوٹل، ہر سینما کو۔ وہ میکلوڈ روڈ پر سیر کرنا چاہتی تھی۔ وہ لارنس گارڈن دیکھنا چاہتی تھی، وہ صرف ان جگہوں کو ہی نہیں، بلکہ اُن لوگوں کو بھی جو اس رنگین فضا کا ایک حصّہ ہیں، وہ ان نظاروں میں مدغم ہونا چاہتی تھی، وہ چاہتی کہ وہ بہترین لباس پہنکر سیر کرنے جائے۔ اور پھر کوئی اُس کی طرف یونہی دیکھ لے۔ اُنہوں۔ دیکھ لے تو کیا ہرج ہے۔ لیکن وہ کس کے ساتھ جاتی؟

صبح وہ لاری میں بیٹھ کر سکول چلی جاتی، اور شام کو واپس آجاتی پھر وہ سکول کا کام کرتی۔ حتیٰ کہ شام کے سائے بڑھنے لگتے، اور آہستہ آہستہ کچھ

کے ارد گرد ایک نہ ختم ہونے والا اندھیرا چھا جاتا۔

اور پھر میں آدھمکا۔ یونہی بے کار سا۔ آوارہ سا، زندگی سے اکتایا ہوا۔ شروع شروع میں کپلا نے مجھے نظر انداز کر دیا۔ جیسے میں کیا ہوں اور میں نے بھی اُسے نظر انداز کر دیا جیسے وہ کیا ہے، یونہی چھوٹی سی بچّی تو لگتی ہے، اور اگر وہ بچی نہ بھی لگتی۔ تب بھی مجھے نظر انداز نہ کرنا پڑتا کیونکہ وہ چچی کی رشتہ دار تھی۔ اور جو چچی کی رشتہ دار ہو۔ وہ میری بھی رشتہ دار ہو گی۔ اور چچی نے ایک دن صاف صاف لفظوں میں کہہ بھی دیا، کہ کپلا تو میرے پاس امانت ہے، مجھے تو اس کا خاص طور پر خیال رکھنا ہو گا۔ لفظ امانت پر چچی نے بہت زور دیا۔

کپلا بالکل چھوٹی سی گڑیا لگتی تھی۔ اس کا قد بہت چھوٹا تھا۔ اگرچہ اس کا جسم گدرایا ہوا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ گیارہ بارہ سال کی ہی معلوم ہوتی تھی۔ اُس کا چہرہ چھوٹا سا، گول سا۔ اُس کی پیشانی چھوٹی سی۔ لیکن اس کی آنکھیں بڑی بڑی سی تھیں، جن میں بے پناہ کشش اور چلبلاپن نمایاں تھا، مجھے تو وہ گڑیا سی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اُس کے ناز، نخرے، اُس کی عادات، اُس کی حرکات میں اتنا چلبلاپن تھا کہ مجھے اُس کی طرف راغب ہونا ہی پڑا۔ اُس کی بھوئیں تنی رہتیں۔ اس کے نتھنے پھڑکتے رہتے اور وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہونٹوں پر زبان پھیرتی رہتی۔ کبھی اُس کا سر ملتا تو کبھی ہاتھ، کبھی دوپٹہ سر پر ہوتا۔ اور کبھی گر کر شانوں پر۔ اور کبھی گرتے

گرتے کمرے کے اردگرد آجاتا۔ اُس کے کپڑے اکثر چُست ہوتے، اور اکثر جسم پر پھنس کر آتے اور اُس کی جسمانی دلکشی کو نمایاں کرتے، لیکن جس بات نے مجھے کپیلا کی طرف خاص طور پر راغب کیا۔ وہ اُس کی مسکراہٹ تھی جو اُس کی آنکھوں میں ناچتی رہتی، اور پھر ڈھلک کر اُس کے سُرخ سُرخ رخساروں کی طرف آجاتی اور پھر اُس کے ہونٹ خفیف سی حرکت کرتے ہوئے ایک طرف کھنچ جاتے، اور مسکراہٹ لبوں پر ناچنے لگتی، اور ناچتی رہتی۔

چند دنوں سے اُس کا چلبلا پن شدید صورت اختیار کر رہا تھا، وہ اکثر چچی سے لڑتی رہتی۔ ان سبزیوں، ترکاریوں میں نقص نکالتی۔ کبھی کہتی، دال میں نمک زیادہ ہے، چپاتی کے کنارے موٹے ہیں۔ چپاتی پر گھی زیادہ لگا ہوا ہے، سبزیاں بے مزہ ہیں بھوک نہیں لگتی۔ یعنی ہر روز جھگڑے، اگر چچی ذرا ڈانٹ دے تو جھٹ ناراض ہو گئیں اور بستر پر لیٹ گئیں۔ ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اب منائے کون۔ اور پھر کبھی کبھی کہتی کہ چائے اچھی نہیں لگتی اور اگر چائے کی بجائے دودھ دیا جائے تو دودھ میں نقص نکال دیتی۔ اور کہتی۔ دودھ میں ملائی پڑی ہوئی ہے، دودھ چھان کر دو اور کبھی کبھی کپڑوں کے متعلق جھگڑے ہوتے، اور وہ کہتی۔ میرے پاس روپے کم رہ گئے ہیں۔ دھوبی قمیض کے بٹن توڑ لایا ہے۔ سلوار کا پائنچہ چھوٹا ہو گیا ہے، آج سیا ہی نہیں ہے۔ کل دوات نہ ہو گی، یعنی ہر روز نئی فرمائش۔ چچی بے چاری تو پاگل ہو گئیں

اور پھر کپلا اُن کے لئے امانت تھی خالص امانت ۔ وہ یہ نہ چاہتی تھیں کہ میں کپلا اور اُن کے جھگڑوں میں دخل دیتا ۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ کپلا ہر روز نقص نکالتی ، اور کبھی کبھی میں گھبرا جاتا اور سوچتا ۔ آخر کیا ماجرا ہے ۔ کپلا اس طرح کیوں کرتی ہے ۔ لیکن اس تاریکی میں روشنی کی کرن دکھائی نہ دیتی ۔ بہر حال مجھے کپلا کی ان شرارتوں کو بھی نظر انداز ہی کرنا پڑا ۔ شرارتیں دن بدن بڑھ رہی تھیں ۔ کپلا کی آنکھوں کی چمک شبنم کے قطروں کی طرح پر فریب اور دلکش ہو رہی تھی ، اُس کے ہونٹوں کی سُرخی شفق کی طرح گہری اور سُرخ ہو رہی تھی ، اور پھر وہ پُر معنی مسکراہٹ ——— کبھی کبھی وہ میری طرف دیکھتی اور پُر معنی نظروں سے مسکرا دیتی ، لیکن میں چپ چاپ تھا ، بالکل اُس پرندے کی طرح جو پرواز کے لئے تیار ہو لیکن کسی غیبی اشارہ کا منتظر ہو ۔

اور پھر میں نے اس دن پوچھ ہی لیا " کپلا تمہاری عمر کیا ہو گی ؟ "

" یہی پندرہ سال " اُس نے دوپٹے کو سینے سے سرکاتے ہوئے کہا ۔

" پندرہ سال " مجھے ایسا معلوم ہوا ۔ جیسے کسی نے میرے منہ پر زور سے چپت لگائی ہے ۔ میں نے گر کر سنبھلنا چاہا اور پھر کہنے لگا " میں تو سمجھتا تھا کہ تم دس بارہ سال کی ہو گی ۔ اور یونہی چھوٹی سی گڑیا " اور بیوقوفوں کی طرح مسکرانے لگا ۔

" جبھی تو آپ ہم سے بات تک نہیں کرتے ۔ بڑے سمجھتے ہیں اپنے آپ کو " اس نے تنک کر جواب دیا ۔

"ہوں ــــــ اب باتیں بنانی بھی آ گئیں"۔ میں نے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں ــــــ آپ تو دانا ٹھیرے۔ ہم تو بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں نا"۔ اُس نے آنکھوں کو مٹکاتے ہوئے جواب دیا۔

"ہم تم سے بات نہیں کریں گے"، میں نے رعب جمایا۔

"آپ سے کون بات کرتا ہے۔ بڑے آئے ہو" اُس نے مُنہ پھُلا کر کہا۔

اور پھر چچی آ گئیں۔ کہنے لگیں "بھئی کیوں لڑتے ہو۔ بہن بھائی میں پھر لڑائی شروع ہو گئی۔ نا بابا۔ مجھے لڑائی اچھی نہیں لگتی۔ اچھا ــــــ اب خاموش ہو جاؤ"۔

اور ایک دن کپلا بہت ہی ناراض ہو گئی۔ چچی نے مجھے بلایا اور کہنے لگیں پرمیشور کے لئے۔ اس ڈائن کو منا لاؤ۔ صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ یونہی مُنہ بنائے اوپر چلی گئی۔ عجیب لڑکی ہے یہ۔

میں کھٹ کھٹ اوپر سیڑھیاں چڑھ گیا۔ آسمان ہلکا سبز اور نیلگوں تھا شفتالو کے پتوں کی طرح۔ دور مغرب کی جانب ایک ہلکا سا غبار چھایا ہُوا تھا۔ جو آہستہ آہستہ مشرق کی سمت بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ بالکل کپلا کے خیالات اور احساسات کی طرح، جو میری طرف شدّت سے بڑھ رہے تھے۔ ململ کا دوپٹہ اوڑھے کپلا چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی، اُس سفید سفید کچھ

کچھ میلے اور دھندلے دوپٹے میں کپلا کے چہرے نے ایک نئی ہیئت اختیار کر لی۔ بالکل اُس آفتاب کی طرح، جس کے ارد گرد غبار چھایا ہوا ہو اور جو اس گرد و غبار کو چیر کر باہر نکلنا چاہتا ہو۔ مجھے دیکھ کر کپلا نے آنکھیں بند کر لیں اور کروٹ لے کر دوسری طرف مُنہ پھیر لیا۔

"کپلا ــــ کپلا چچی بلاتی ہیں" میں نے زوردار لہجے میں کہا۔ کپلا خاموش تھی۔

میں نے کپلا کا سر ہلایا۔ اور پھر دھیمی آواز میں کہا "کپلا ــــ اُٹھو۔ چچی بلاتی ہیں"

"مجھے آج بھوک نہیں ہے۔

"ارے کچھ تو کھا لو"

میں نے کہہ دیا "مجھے بھوک نہیں ہے"

میں نے ڈوپٹہ اُس کے جسم سے اتار پھینکا اور غرّاتے ہوئے کہا۔

"اُٹھتی ہو یا نہیں ــــ نہیں تو زبردستی نیچے لے جاؤنگا"

"ہاتھ تو لگاؤ" اُس نے چیخ کر کہا۔

"اچھا ــــ تو یہ بات ہے۔ آخر بچی ہو نا۔ بالکل بچوں جیسا سلوک چاہتی ہو"

"اٹھا کر نیچے لے جائیے" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ ناچنے لگی، اور پلکوں میں سے ہوتی رخساروں پر ڈھلکی، اور پھر دو چھوٹے پتلے سے ہونٹ مسکراہٹ سے کانپ اُٹھے، بالکل گلاب

کی پتیوں کی طرح، جن کو ہوا کا جھونکا چوم گیا ہو۔ اور پھر میرے ہاتھ بڑھے، میں نے کلائی زور سے پکڑی، اور اپنی طرف کھینچا۔ وہ خود بخود میرے سینے سے آلگی، بالکل ربڑ کے فیتے کی طرح جو جھٹکا کھا کر واپس آجاتا ہے، اُس کا گرم گرم سانس میرے رخساروں کو چھوتا ہوا معلوم ہوا۔ اُس کی آنکھیں آبگوں ہوگئیں۔ اور مسکراہٹ تاؤ بن کر تیرنے لگی۔ ناک کے نتھنے پھیل گئے اور سانس زور زور سے چلنے لگا۔ پیشانی عرق آلود ہوگئی۔ میں کچھ گھبرا سا گیا۔ کیپلا نے جھٹ اپنے آپ کو جھٹک دیا۔ اور چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"میں چچی سے کہدونگی" اس نے میری طرف گھورتے ہوئے کہا۔

"کیا کہو گی"

"یہی —— کہ آج آپ نے مجھے چھیڑا ہے"

"بیہودہ بکواس۔ میں نے تمہیں کب چھیڑا ہے"

"آپ نے کیوں میری کلائی پکڑی۔ میری کلائی میں درد ہوتا ہے۔ لو یہ کانچ کی چوڑیاں بھی ٹوٹ گئیں"

اور پھر وہ مسکرانے لگی۔

"اچھا اب چلو" میں نے رعب ڈالتے ہوئے کہا۔

"اچھا بابا۔ چلتی ہوں۔ تم جیتے۔ میں ہاری۔ اور وہ چل پڑی۔

....

اس واقعے کے بعد کیپلا کی عادات بدل گئیں۔ گو وہ چچی سے ہر بات

پر جھگڑتی تھی، اور چچی تنگ آ کر کہہ دیتی "کہ میں تمہارے پتا جی کو لکھتی ہوں کہ کپلا میرا کہنا نہیں مانتی۔ اب اسے واپس بلا لو" اور اکثر کپلا ناک سکوڑ کر جواب دیتی "لکھ دیجئے نا۔ میں خود یہاں سے تنگ آ گئی ہوں" اور میری طرف مسکرا کر دیکھتی۔ جیسے وہ مجھ سے کہلوانا چاہتی ہے کہ نہیں نہیں، مت جاؤ کپلا"

اگرچہ وہ چچی سے ہر بات پر لڑتی جھگڑتی تھی۔ لیکن اب میری ہر بات مان جاتی تھی۔ اکثر چچی اسے کسی بات سے منع کرتے کرتے تھک جاتی تو وہ مجھ سے کہتی "لو بھئی۔ اب تم سمجھاؤ اسے۔ میں تو کہہ کہہ کر ہار گئی"

جب وہ کھانا نہ کھاتی تو مجھے اُسے منانے پر مامور کیا جاتا۔

"کھانا کیوں نہیں کھاتی ہو"

"نہیں کھاؤں گی" وہ غراتی۔

کیا نقص ہے، میں زور سے کہتا۔

"مجھے کھانا اچھا نہیں لگتا"

"میں نے ابھی ابھی کھایا ہے، مجھے تو نہایت ہی لذیذ لگا ہے"

"تو میں کیا کروں" اور وہ گھور کر میری طرف دیکھتی۔ اور میں اُس کی آنکھوں کی طرف دیکھتا۔ جو ابھی نمناک ہو رہی تھیں۔ اور اب یکایک شعلہ افگن ہو جاتیں۔ اُسکی آنکھوں سے شرارے نکلنے لگتے اور پھول جیسے گال تمتما اُٹھتے۔ اور ہونٹ تھرانے لگتے۔

"کھاؤ۔ بابا۔ میری حالت پر رحم کرو" میں ذرا پیار سے کہتا۔

لیکن امانت ——— امانت ہی ہوتی ہے، اگر کپلا چچی کی امانت ہے، تو میری بھی امانت ہے۔ اس میں خیانت کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو کون ذمہ دار ہو گا؟ چچی منہ دکھانے کے قابل نہ رہے گی۔ شادی کرنے سے تو میں رہا۔ یہ تو کپلا بھی جانتی ہے، کہ وہ مجھ سے شادی نہیں کر سکتی۔ وہ میری چچی کی رشتہ دار ہے، اور میں اس کی چچی کا رشتہ دار۔ درمیان میں چچی حائل ہے۔ چین کی دیوار کی طرح، ان گنت صدیوں کا تعصب اور جہالت راستہ روکے کھڑی ہے، اس ماحول سے نکلنا مشکل ہے چاہے امنگیں کچلی جائیں خواہشیں مردہ ہو جائیں۔ عورتیں جوانی میں بوڑھی ہو جائیں۔ لیکن چین کی دیوار قائم ہے اور قائم رہے گی۔

کپلا کی مہربانیاں میرے لئے بارِ گراں ہو گئیں، اس انوکھے پیار کا انوکھا ہی مزا تھا۔ اب کپلا میری ہر بات مان جاتی تھی۔ اب وہ ہر بات کا احسان مجھ پر جتانے لگی۔ اس کی ہر نگاہ، ہر حرکت، ہر فقرہ مجھے خوش کرنے میں صرف ہوتا۔ گو وہ گھر کا کام کاج نہیں کرتی تھی۔ اور چچی کی ہر بات کو رد کر دیتی تھی چچی مجبور ہو کر مجھے کہتی، اور میں کپلا سے کہتا۔ اور پھر کہیں جا کر وہ کام کرتی۔ چچی نے کئی بار کپلا کو ساڑھی پہننے کو کہا تھا

لیکن ہر بار کپلا نے انکار کر دیا۔ یونہی کہہ دیتی "ساڑھی مجھے اچھی نہیں لگتی۔ مجھے باندھنی نہیں آتی، مجھے بلاؤز پہننے سے شرم آتی ہے" ایک دن میں نے بھی کہہ دیا کہ ساڑھی پہنا کرو۔ چھوٹے قد والی لڑکی کو ساڑھی اچھی لگتی ہے۔ دوسرے دن دیکھا تو کپلا ساڑھی پہنے کھڑی تھی۔ آسمانی رنگ کا بلاؤز پہنا ہوا تھا اور وہ خوبصورت گول گول بازو، بلاؤز سے باہر جھانک رہے تھے، بالکل سیب کی شاخوں کی طرح۔

"خوب بھئی۔ خوب لگتی ہو کپلا۔ اس ساڑھی میں"

اور وہ میری طرف لپکی۔ اور میں پیچھے ہٹ گیا۔ بالکل غیر شعوری طور پہ۔ اُسکی ترچھی نگاہیں پھر اُبھریں! انہوں نے مجھے تاکا۔ اور پھر وہ اپنے ہاتھوں سے ساڑھی درست کرنے لگی۔

ان باتوں نے مجھے اور بھی پریشان کر دیا۔ اور میں کچھ اداس اور مضمحل رہنے لگا۔ اکثر رات بھر مجھے نیند نہ آتی۔ کیونکہ کپلا کی چارپائی تھوڑے ہی فاصلے پہ ہوتی۔ اور درمیان میں چین کی دیوار۔ ایک ناقابلِ عبور دیوار۔ چچی جلد ہی سو جاتی، اور چچی کے خراٹوں کی آواز آتی۔ اور میں زیادہ پریشان ہو جاتا۔ رات کی گہرائیاں اور گراں ہو جاتیں، اور تاریکی۔ اور اندھیرا ہر طرف پھیل جاتا۔ لیکن پھر۔ خِر ——— خِر ——— خِر۔ یہ آوازیں کمرے کی تاریکی کو چیر کر نکل جاتیں خر۔ خر۔ خر، بے ہودہ۔ بے معنی۔ خر۔ خر مجھے ایسا معلوم ہوتا۔ جیسے تمام دنیا جاگ رہی ہے، جیسے اندھیرا نہیں ہے۔ جیسے

کمرے میں ایک ہزار کینڈل پاور کا قمقمہ لگا دیا گیا ہے۔ اور پھر خر خر خرا ہتھوڑے کی ضربوں کی طرح دماغ پر چوٹیں لگ رہی تھیں۔ کیوں کامل سکوت نہیں۔ کاش خر خر خر بند ہو جائے۔ اور تاریکی ان خراٹوں کو اپنے اندر جذب کر لے۔ اس پھیلے ہوئے اندھیرے میں مجھے کمرے کی ہر چیز نظر آتی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ کمرے کی ہر شئے ف ۔ دبن کر میری طرف جھانک رہی ہے، سامنے میز پر پڑا ہوا ہیٹ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے میری ہر حرکت کو اپنی ڈائری میں نوٹ کر رہا ہے، سامنے ٹنگی ہوئی نکٹائی میرے گلے میں پھنس کر رہ گئی ہے، اور المار ی میں سے کتابیں باہر نکل پڑی ہیں اُن کا ہر ورق کتاب سے نکل کر میرے گرد چکر لگا رہا ہے، اسٹول، قمیصیں پاجامے، سب اپنی اپنی جگہ پر اجمان ہیں، اور حیران کن نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے ہیں، اور پھر خر خر خر کبھی کبھی کوئی کُتا بھونکتا تو اُس کی آواز میرے خیالات کو چیر کر آگے نکل جاتی۔ اور جب کبھی کبھی چچی کے خراٹوں کی آواز بند ہو جاتی، تو اس گہری خاموشی میں کوئی لمبے لمبے سانس لیتا۔ خراٹوں کی آواز پھر بڑھ جاتی، اور گہری خاموشی اور اندھیرے میں کسی کے سانس اُلجھ اُلجھ کر رہ جاتے۔ اور یونہی رات گذرتے گذرتے گزر جاتی، اور جب صبح ہوتی تو کپلا کا چہرہ اترا ہوا ہوتا۔ اور میرے چہرے پر رات کی پریشانی کے آثار نمایاں ہوتے۔

اس ذہنی انتشار نے ہم دونوں کے مزاج کو چڑچڑا کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ہمارے گلے میں ڈاٹ پھنس کر رہ گیا ہے، اب کپلا کی آنکھوں میں

چمک نہ تھی، بلکہ ایک میلا سا، دھندلا سا غبار، جو ذہنی پریشانی کو زیادہ نمایاں کرتا ہے، اس کی مسکراہٹ میں کھنچاؤ سا آگیا تھا۔ شاید وہ ان مسکراہٹوں کے ردِّ عمل کو سمجھ چکی تھی کہ ان کا اثر تو ہوتا ہی نہیں۔ اگر وہ میرے سامنے آجاتی تو میں چپ چاپ ہو جاتا۔ میں اس کی آنکھوں کی طرف نہ دیکھتا، اب اس کے ہونٹ نہ پھڑپھڑاتے، اس کے نتھنے نہ پھیلتے۔ پیشتر اسکے میں کچھ کہتا وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتی۔ لیکن نظروں سے اوجھل ہو جاتا اس مسئلے کا حل نہ تھا۔ جوں جوں میں اس مسئلے پر غور کرتا۔ یہ زیادہ پیچیدہ ہوتا جاتا۔ کبھی یہ خیال آتا کہ اگر کبلا گھر چلی جائے تو لیکن اس خیال کے آتے ہی میرے دل پر ایک ٹھیس لگتی۔ جو ناقابلِ برداشت معلوم ہوتی۔ لیکن اس ذہنی پسپائی سے کیا حاصل؟ اس ذہنی کوفت کا کیا علاج ہوگا؟

اور پھر ایک رات جب ہم چھت پر سوئے ہوئے تھے۔ چچی کے پیٹ میں درد شروع ہو گیا۔ نہایت شدید درد۔ وہ درد سے چلّانے لگی۔ اور مجھے مجبوراً اٹھنا پڑا۔ چاروں طرف اندھیرا تھا، آس پاس کے مکانات تاریکی میں اونگھ رہے تھے، دور۔ دور۔ مغرب کی جانب بجلی چمکتی۔ اور آن واحد میں غائب ہو جاتی، ہوا گرم تھی، اس لئے دن کی تپش نے رات کو پریشان کر دیا تھا۔ پیاس سے حلق خشک ہو رہا تھا میں جلد جلد سیڑھیاں اُترنے لگا۔ جب میں سیڑھیاں اُتر چکا تو پھر

کھٹ ـــــ کھٹ ـــــ کھٹ کی آواز آئی ۔ میں ٹھٹھر گیا ۔

" کون ہے " میں اندھیرے میں چلایا ۔

" کوئی نہیں ، میں ہوں " کپلا نے جواب دیا ۔

بجلی زور سے چمکی ۔ اور ایک لمحے کے لئے روشنی ہو گئی ۔ پھر کھٹ کھٹ کی آواز آئی ۔

" کیا کام ہے تمہیں کپلا "

" پیاس لگی ہے بھیّا "

اور وہ نیچے اترنے لگی ۔ اور میں سیدھا کمرے میں چلا گیا ۔ بجلی کے قمقمے کو روشن کیا ۔ اور امرت دھارا کی شیشی ڈھونڈنے لگا ۔ اتنے میں کپلا آ گئی ۔

" پانی پی لیا تم نے "

" پیاس نہیں بجھتی " اور اس کی نگاہیں میرے ننگے بازوؤں پر جم گئیں ۔

میں نے صرف دھوتی باندھی ہوئی تھی اور اوپر کا دھڑ ننگا تھا ۔ اس کی نگاہیں میرے جسم کو آہستہ آہستہ ٹٹول رہی تھیں ۔ اور پھر وہ اوپر بڑھیں چوڑا چکلا سینہ ۔ باہوں کے پٹھے مضبوط اور توانا اور پھر اوپر ـــــ سینہ کسی یونانی بت کی طرح ابھرا ہوا ۔ اور پھر نگاہیں رک گئیں ۔ وہ اوپر نہ بڑھ سکیں ۔ شاید جذبات کی فراوانی نے انہیں آگے نہ بڑھنے دیا ۔ میں ان چند سکنڈوں میں پھنک گیا ۔ گردن کی رگیں پھیل گئیں ۔ باہوں کے

پٹھے پھڑپھڑانے لگے۔ سینہ زیادہ ابھر گیا۔ آنکھوں میں خون دوڑنے لگا۔ اور کن پٹیاں جلنے لگیں۔ میں آگے بڑھا۔ لیکن یکبارگی پیچھے ہٹ گیا میں نے کمرے کی دیواروں پر نگاہ دوڑائی۔ ہر طرف۔ امانت ——— امانت ——— امانت ——— لکھا ہوا تھا، لیکن میں چچی کے لئے امرت دھارا لینے آیا تھا۔ امانت اور امرت دھارا۔ زندگی اور دوا۔ خوشی۔ پسپائی ——— فراری۔ رشتہ داروں کے طعنے۔ گالیوں کی بوچھاڑ۔ شرافت کا جنازہ۔ لیکن کیپلا اپنی جگہ کھڑی تھی۔ بالکل اس پرندے کی طرح جسے شکاری نے چاروں طرف سے روک رکھا ہو۔ اور شکاری کون تھا، شاید اس کے جذبات، اس کے اپنے احساسات، جو گرہ گرہ کر اُبھرتے تھے، جو بگڑ بگڑ کر بنتے تھے کمرے میں بجلی کا قمقمہ مجھے نہایت ہی بھدا معلوم ہوا۔ جی میں آیا کہ قمقمے کو توڑ دوں۔ تاکہ امانت کا ہر تصور میرے دماغ سے نکل جائے۔ یہاں اندھیرا نہیں ہے۔ اتنی روشنی کہاں سے آگئی۔ باہر کیوں اندھیرا ہے، کاش یہاں بھی اندھیرا ہو جائے۔ لفظ امانت اس روشنی میں سوالیہ نشان بن کر میری رگوں میں کانٹا بن کر چبھ رہا تھا۔ لیکن یہ روشنی کاش یہاں بھی اندھیرا ہو جائے۔ ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہ دے۔ لیکن بجلی کا قمقمہ روشن ہے، میرے پسے ہوئے خیالات کی طرح یہ خیالات مرتے نہیں۔ اب تک جاگ رہے ہیں، اس طوفان میں سانپوں کی طرح رینگ رہے ہیں۔ بے جان، فرسودہ خیالات، لیکن یہ روشنی۔ یہ امرت دھارا۔ اور یہ امانت۔ لیکن یہ مری امانت تو نہیں۔ چچی جی کی

ہے۔ بچی کے پیٹ میں درد ہے، اسے امرت دھارا چاہیئے لیکن مجھے امرت دھارا مل رہی ہے۔ میری روح کو بھی ایذا پہنچ رہی ہے، لیکن میرے لئے امرت دھارا امانت ہے، پھر بجلی زور سے چمکی اور میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اوہ۔ بچی درد سے کراہ رہی ہوگی۔ اس خیال کے آتے ہی میں باہر نکل گیا۔ اور سیدھا چھت پر چلا گیا۔ بادل پھٹ چکے تھے، دور مغرب کی طرف بادل جھکے ہوئے تھے، سامنے والے باغ سے ہری ہری گھاس کی خوشبو آرہی تھی، اور بھیگی ہوئی مٹی کی سوندھی خوشبو میرے تھکے ہوئے دماغ میں تحلیل ہو رہی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ لگ گیا، اور اندھیرے کی لہروں کو اپنے اندر جذب کرنے لگا۔ نیچے والے مکان میں کسی نے بتی روشن کی۔ روشنی ...... اور اندھیرا.... اندھیرا..... اور روشنی کیا کبھی اندھیرا نہ ہوگا۔ بالکل گھُپ اندھیرا چاروں طرف اندھیرا۔ اُس کے جسم کے ہر ذرے میں اندھیرا سما جائے یا بالکل روشنی ہو جائے۔ چاروں طرف روشنی۔ اور اندھیرا کبھی نہ ہو۔ کہیں نہ ہو۔ میں سوچتے سوچتے تھک گیا۔ کہیں سوچتے سوچتے پاگل نہ ہو جاؤں اس سوچنے سے کیا فائدہ۔ اور پھر کسی کی آہٹ آئی۔ اتنے میں کپیلا آگئی۔ بجلی پھر کوندی۔ کپیلا کا چہرہ پیلا اور زرد نظر آیا۔ اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے، اور آنکھیں کسی نیم جان پرند کی طرح بے جان اور آوارہ نظر آرہی تھیں۔ ہاتھ میں امرت دھارا کی شیشی تھی۔ یہ امرت دھارا کس کے کام آئے گی؟ مغرب کی طرف بجلی چمک رہی۔ ہوا مٹی سے بوجھل ہو رہی تھی، اور حلق خشک اور بند ہوا جاتا جاتا تھا۔ اب آہستہ آہستہ اندھیرا بکھرنے لگا اور مشرق کی طرف چند ستارے نمودار

ہو گئے، اور ہلکی ہلکی روشنی پھیلنے لگی

. . . .

کپیلا کو گئے قریباً دو سال ہو گئے ہیں۔ میں اُس کی شکل صورت کو قریباً قریباً بھول چکا ہوں۔ لیکن اُسکے جذبات، احساسات، اور تصورات میرے دل و دماغ پر حاوی ہیں اور اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ میری زندگی کا اہم جزو بن گئے ہیں۔ میں نے ان جذبات کو ہر طریقے سے کچلنے کی کوشش کی لیکن جتنی شدّت سے میں نے کچلنا چاہا۔ اتنی شدّت سے یہ ابھرتے رہے۔ شاید کپیلا اب بلند قامت ہو گئی ہے، اُس کا چھوٹا سا چہرہ بڑا ہو گیا ہے، وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت اور حسین ہو گئی ہے۔ لیکن کون جانتا ہے کہ وہ کہاں ہے اور وہ اب کیسی ہے، کم از کم میں تو کچھ نہیں جانتا۔ ہو سکتا ہے، کہ اُس کے رکے ہوئے جذبات نے نئی راہ تلاش کر لی ہو۔ لیکن میرے لئے اسکے جذبات زندہ ہیں، اب تک تر و تازہ ہیں۔ میں انہیں اُسی شدّت سے محسوس کرتا ہوں، جس شدّت سے وہ محسوس کیا کرتی تھی، اور میں آج تک فیصلہ نہ کر سکا۔ کہ جو کچھ میں نے کیا۔ وہ اچھا تھا۔ یا جو میں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اچھا تھا۔

. . . .

طوفان کے بعد

میں تمہیں ایک عرصہ سے خط لکھنا چاہتی تھی۔ گو تم سے جدا ہوئے ابھی چند مہینے ہی ہوئے ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں تم سے بہت دور چلی گئی ہوں اور شاید اب میری اور تمہاری ملاقات کبھی نہ ہو۔ گو اس بات کا اظہار ایک احمقانہ فعل ہے اور یہ باتیں تم پر کوئی اثر نہیں کر سکتیں لیکن میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں جو کچھ چاہتی تھی وہ نہ ہُوا، اور جو نہ چاہتی تھی وہ ہُوا۔ یہ خط تمہیں ملے گا بھی یا نہیں اس کا بھی مجھے پتہ نہیں، کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ تم اب اس مکان سے کب کے بھاگ چکے ہو گے جسطرح کہ میں اس رات اپنے مکان سے بھاگ آئی تھی۔ مجھے اپنے کئے پر بالکل ندامت نہیں۔ شاید ایسا ہی ہونا چاہیے۔ جیسا کہ ہُوا۔ اور آج جبکہ میں تمہیں اپنا

آخری خط لکھ رہی ہوں تو اس کا یہ مطلب نہ سمجھ لینا کہ میں محبت کے زیر اثر اپنا سب کچھ گنوا بیٹھی۔ دُنیا کی نظروں میں شاید میں اپنا اثاثہ لٹا چکی ہوں، اور ماں باپ کی نگاہوں میں کافی گر گئی ہوں۔ لیکن دنیا میں صرف ماں باپ ہی نہیں ہوتے، دنیا میں صرف دنیا والے ہی نہیں ہوتے۔ اپنا آپ بھی کچھ ہوتا ہے۔ اپنی انفرادی حیثیت بھی کچھ ہوتی ہے۔ اس خط کا صرف واحد مقصد یہ ہے کہ میں تمہیں بتاؤں کہ مجھے تم سے بالکل محبّت نہ تھی۔ کہیں تم اس نشہ میں چُور نہ رہو۔ اور اپنے دوستوں سے اس مہم کو سر کرنے کی کہانیاں سُناتے رہو کہ کس طرح ایک لڑکی تم پر فدا ہوئی اور وہ سب کچھ لٹا بیٹھی۔ گو میں سمجھتی ہوں کہ ہندوستان میں جہاں عورت کو اس کی عصمت پر خریدا جاتا ہے۔ میں عورت کی عصمت کی قیمت کو جانتی ہوں اور یہ جانتے ہوئے میں نے اپنے آپ کو کیسے تمھارے حوالے کر دیا۔ اس کی بہت سی وجوہات ہیں۔ ہر بات کی وجہ ہوتی ہے۔ شاید تمھیں اپنی چالاکی، اپنی یا کاری یا لڑکیوں کے پھنسانے کی ترکیبوں پر ناز ہو گا۔ اور تم سمجھتے ہو گے کہ تم نے ایک تعلیم یافتہ لڑکی کو اپنی ہوس کا شکار بنا یا۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ تم غلطی پر ہو۔

تم نے مجھے غلط سمجھا۔ اگر میں یہ کہہ دوں کہ تم مجھے سمجھ ہی نہ سکے تو یہ صاف بیانی ہو گی۔ اگر میں نے اپنے آپ کو تمھارے حوالہ کیا تو اس کا باعث تم نہ تھے بلکہ وہ ماحول جس میں ہم پلتے رہے۔ جس میں ہم رہتے رہے اور جس ماحول میں تم ایکا ایکی آئے اور میرے جذبات کو تم نے پھر سے بیدار کیا جیسا

کہ تم جانتے ہو کہ میں متوسط طبقے میں پیدا ہوئی ہوں اور متوسط طبقہ اپنے
اخلاق کا خاص طور پر خیال رکھتا ہے۔ متوسط طبقے کے لوگ اخلاق کی ترازو
پر اپنے آپ کو جانچتے ہیں۔ ان کے پاس سونا ہو یا نہ ہو۔ رتبہ ہو یا نہ ہو لیکن
اخلاق کا طوق اپنی گردن میں ہمیشہ پہنے رہتے ہیں اور کبھی کبھی اخلاق کی یہ
لمبی زنجیر اُن کے لئے موت کی زنجیر بن جاتی ہے۔ یہ نام نہاد اخلاق جو
ہمارے متوسط طبقے کا اوڑھنا بچھونا ہے ہمارے لئے بہت ضرر رساں ہے۔
میں وعظ کرنا نہیں چاہتی نہ ہی سماج کی خامیاں کہنا چاہتی ہوں۔ مجھے
سماجی خامیوں سے کیا واسطہ۔ میں تو یہ بات ذہن نشین کرانا چاہتی ہوں کہ
میں نے جو قدم اٹھایا وہ ہمارے سماجی ماحول کے عین مطابق تھا۔ اس
میں نہ تو تمھارے حسن کی کشش کا اثر تھا اور نہ ہی تمھاری ذہانت اور
ذکاوت کا ہاتھ۔ اور مجھے تمھاری ذہانت کا کچھ اتنا علم بھی نہیں۔ میں تو
یہ بھی نہیں جانتی کہ تم ذہین ہو۔ میں اتنا جانتی ہوں کہ تم بی۔ اے پاس
ہو۔ تو کیا ہر شخص جو بی۔ اے یا ایم۔ اے کر لیتا ہے وہ ذہین یا کامل
ہو سکتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے اور نہ تھا۔ اور نہ ہی مجھے ان یونیورسٹیوں
پر اعتبار ہے۔ یہ امتحان جو چند کتابوں کے رٹنے پر لئے جاتے ہیں ہماری
ذہانت کا ثبوت نہیں بلکہ ہماری سماجی بیوقوفی پر دلالت کرتے ہیں
خیر مجھے اس سے کیا واسطہ کہ تم ذہین ہو یا نہیں ہو۔ میں تو کہہ رہی تھی
کہ تم کہیں یہ نہ سمجھ لو کہ تمھاری خوبصورتی پر مرتے ہوئے میں تمھاری
خواہشوں کا شکار ہوئی۔ اگر ایسا کرنا ہوتا تو کالج میں کسی حسین اور خوبصورت

لڑکے سے محبّت کر لیتی۔ شاید اس وقت محبت کر سکتی تھی، اب تو محبّت سے کوسوں دور بھاگتی ہوں۔

تو میں کہہ رہی تھی تم اتنے حسین نہ تھے کہ میں تمھارے بغیر زندہ نہ رہ سکتی تھی، اور آنِ واحد میں میں نے اپنے جسم کو تمھارے حوالے کر دیا۔ اور تم نے اسے بغیر کسی حیل و حجت کے قبول کر لیا۔ ہاں میں کہہ رہی تھی کیا کہہ رہی تھی۔ ذہن میں خیالات امڈے چلے آتے ہیں اور کسی وقت خیالات گڈ مڈ ہو جاتے ہیں، اور ذہن کی سطح پر پوری طرح نہیں ابھرتے۔ ٹھیرو جاؤ۔ ذرا سوچنے دو۔ ہاں میں کہہ رہی تھی کہ متوسط درجہ کے لوگوں کو اپنے اخلاق سے بہت زیادہ محبّت ہے۔ وہ ہر چیز کو اخلاق کے کانٹے پر پرکھتے ہیں۔ یعنی ان کی لڑکی اگر کسی جوان لڑکے سے گفتگو کرنے لگے تو وہ جھٹ اس بات کو اخلاق پر تولتے ہیں۔ اگر گھر والوں کی نظروں میں یہ بات اخلاق پر پوری نہیں اترتی، جیسا کہ صاف ظاہر ہے کہ نہیں اترے گی، تو وہ اپنی لڑکی کو اس جوان لڑکے سے گفتگو نہیں کرنے دیں گے۔ یہ تو صاف ظاہر ہے کہ گھر والوں نے مجھے کبھی کسی غیر شخص سے کلام کرنے کی اجازت نہ دی اور نہ ہی میں نے ایسی اجازت طلب کرنے کی جرأت کی۔ اگر میں چاہتی تو ان باتوں کے لئے راستہ نکال سکتی تھی۔ لیکن دل کچھ ان باتوں کے لئے تیار نہ تھا۔ برسوں کی ذہنی غلامی نے دماغ پر ایک آہنی غلاف چڑھا دیا تھا جس کو مغربی تعلیم کی بی۔ اے کی ڈگری بھی نہ توڑ سکی۔ تم تو پوچھ سکتے ہو کہ بھلا میں خود بی۔ اے میں پڑھتی رہی اور وہ بھی بھگوان داس کالج میں

جہاں لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے پڑھتے ہیں تو پھر بھی مجھے یہ جرأت نہ ہوتی کہ کسی لڑکے سے آشنائی کر لیتی۔ محبت کی پینگیں بڑھاتی۔ رات کے اندھیرے میں کسی کے ساتھ سینما چلی جاتی اور بہانہ بتاتا تو مشکل بات نہیں۔ گھر والوں سے کہہ دیا کہ کالج میں لڑکیوں کا ڈراما ہے یا فلاں پروفیسر کو لٹریچر پر نہایت شاندار لیکچر دینا ہے۔ پھر ہزاروں بہانے بنائے جا سکتے ہیں جو یہاں میں نہیں لکھنا چاہتی اور کسی شام کو اپنے نئے ساتھی کے ساتھ لارنس باغ کی سیر کو جاتی عورتیں بہترین ساڑھیاں پہنے ہوئے اس جنت مقام پر آتی ہیں۔ ہر طرف پھول کھلے ہوئے ہوتے ہیں۔ مہکی مہکی خوشبو، رنگ برنگ کی ساڑھیاں نیلی، پیلی، ارغوانی، ہوا میں لہراتے ہوئے بال، اور لڑکوں کا جمگھٹا، بہترین سوٹوں میں ملبوس، ٹائیاں ہوا میں اڑ رہی ہیں اور غول کے غول اِدھر اُدھر لڑکیوں کے پیچھے بھاگے جا رہے ہیں۔ لڑکیاں خوش ہوتی ہیں، ہنستی ہیں، دل میں امنگیں اٹھتی ہیں، جسم میں گدگدی ہوتی ہے کسی سے آنکھیں ملتی ہیں، یونہی جیسے تم نہیں جانتے اور شاید وہ پھر مل نہ سکے۔ اور کبھی ملنے بھی نہیں۔ لیکن کسی کی آنکھیں بار بار تمہاری طرف اٹھتی ہیں۔ تمہارے قدم جلدی جلدی اٹھتے ہیں اور اپنی سہیلیوں کو ساتھ لے کر وہ اوجھل ہو جاتی ہیں۔ باتیں ہوتی ہیں اور ہر روز ہوتی رہیں گی۔ چاہے متوسط درجے کے لوگ چیخ چیخ کر مر جائیں۔ چاہے وہ دنیا کے بہترین شاعروں کی غزلوں کو آگ کی نذر کر دیں۔ چاہے وہ مخاشیوں کی کتابوں کو قابل ضبطی قرار دیں۔ لیکن یہ کشش جو ایک جوان عورت اور مرد

کے درمیان ایک دوسرے کو دیکھنے سے ہوتی ہے یہ کبھی نہیں مر سکتی۔ یہ ایک فطری ضرورت ہے جس سے تم بھی انکار نہیں کر سکتے۔ یہ متوسط درجے کے لوگ جن پر اخلاق ایک ہوّا بن کر چھا گیا ہے یہ چاہتے ہیں کہ ان کی بہو بیٹیوں کے دماغ میں ایسے خیالات نہ آئیں، یہ چاہتے ہیں کہ گو وہ ہر سال ایک بچّہ پیدا کر دیں لیکن ان کی لڑکیوں کو یہ پتہ نہ چلے کہ یہ بچّے کہاں سے آتے ہیں۔ کسی کا گرم سانس انہیں نہ چھو جائے۔ کسی غیر انسان کی آنکھیں ان کی لڑکیوں پر نہ پڑ جائیں۔ یہ گندے ناول نہ پڑھیں، یہ عشقیہ نظمیں نہ سنیں، یہ کسی خوبصورت لڑکے کو دیکھ کر خوش نہ ہوں۔ یہ موسیقی کی طرف رجوع نہ کریں۔ یہ ناچ کو نہ اپنائیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی سب کچھ ہو رہا ہے۔ لڑکیاں ناچتی ہیں، گاتی ہیں۔ کسی کے خمار آلود نگاہوں کے تلذذ سے محفوظ ہوتی ہیں۔ رات کی تاریکیاں ان کے لئے بوجھل بن جاتی ہیں۔ اور وہ تصورات کی دنیا میں کھو جاتی ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ جو کچھ وہ چاہتے ہیں کبھی نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہو کر رہے گا۔ یہ متوسط طبقے کے لوگ اپنے آپ کو ذہنی پریشانی میں مبتلا کرتے ہیں۔ خود چین سے رہ نہیں سکتے۔ اپنے بچوں کی زندگیوں کو برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اُف۔ یہ اخلاق! لیکن تمہیں اخلاق سے کیا تعلق۔ تم اخلاق سے کوسوں دور بھاگتے ہو۔ میں کتنی خوش ہوں کہ تم اخلاق سے بالاتر ہو اور تم نے مجھے بھی اخلاق سے بالاتر کر دیا۔ اور پھر میں نے "تم"، کہہ دیا۔ گو مجھے یہ کہنا چاہیئے تھا کہ مجھے ماحول نے اخلاق سے بالاتر کر دیا۔ لیکن کیا دنیا میں اخلاق کوئی

چیز نہیں۔ بحث کی ضرورت نہیں۔ پند و نصیحت کا وقت نہیں۔ اور میں کیا نصیحت کر سکتی ہوں اور نہ ہی میں نصیحت کرنے پر یقین رکھتی ہوں۔ میں ان ناصحوں سے کوسوں دور بھاگتی ہوں "یہ نہ کرو۔ وہ نہ کرو۔ فلاں بزرگ نے یہ کہا ہے، فلاں کتاب میں یہ لکھا ہے۔ مذہب اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ کتابیں، مذہب، بزرگ......"

خیر میں کہہ رہی تھی کہ طالب علمی کے زمانہ میں کسی نوجوان نے مجھ سے محبت کرنے کی ہمت نہ کی۔ اور اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ میں بدصورت تھی۔ تھی نہیں بلکہ ہوں۔ اس کا تمہیں علم بھی ہے اور میری بدصورتی کا فائدہ جس طریقہ سے تم نے اٹھایا اس کی بھی داد دیتی ہوں۔ میں بدصورت کیوں ہوں۔ اس کی بھی وجہ ہے۔ تم شاید میری باتوں سے چڑ جاؤ اور خط کو پڑھے بغیر پھینک دو اور دل میں سوچو کہ کیا ہر بات کی کوئی وجہ ہوتی ہے۔ لیکن میرا آخری خط پڑھنے میں تمہیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ یہ میرا آخری خط ہے۔ تمہیں ان خوبصورت لمحوں کی قسم جن کی یاد میرے ذہن پر مُرتسم ہے۔ سچ کہتی ہوں میں وہ لمحے زندگی بھر یاد رکھوں گی۔ میں ان حسین لمحوں کو کبھی بھول نہیں سکتی۔ وہ میری زندگی کا بہترین سرمایہ ہیں۔ وہ میری جوانی کی اوّلین اور آخری امنگوں کا نچوڑ ہیں۔ میں نے ان لمحوں سے کتنا حظ اٹھایا تھا۔ اس کا میں پھر ذکر کروں گی۔ چاہے متوسط درجے کے لوگ مجھے فاحشہ ہی کیوں نہ کہدیں۔ پہلے میں یہ بتادوں کہ میں بدصورت کیوں ہوں، میری ماں! تم نے دیکھی ہے نا!

مجھے اپنی ماں سے محبّت ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اپنی ماں کی برائیوں کو نہیں جانتی۔ اس کے عیب مجھ سے چھپے نہیں ہیں۔ وہ نہایت موٹی اور بھدّی عورت ہے۔ نہایت ہی بھونڈی۔ گو اس کے چہرے کے خدوخال اتنے بُرے نہیں۔ لیکن اسکے جسم کی ساخت اتنی بُری ہے کہ وہ بڑی بھدّی عورت معلوم دیتی ہے۔ کہو تو میں اسکے جسم کے ہر نقش کو یہاں بیان کر دوں۔ لیکن مجھے متوسط درجے کے لوگوں کا خیال ہے کہ کہیں مجھے زندہ پھانسی پر نہ لٹکا دیں۔ صرف اس قصور پر کہ ایک بیٹی ہو کر اپنے ماں باپ کے نقائص بیان کرتی ہے۔ اور میرا باپ میری ماں سے بھی بدصورت، چھوٹا قد، چہرہ لٹکا ہوا، گال اندر دھنسے ہوئے۔ پتلا سا جسم جس میں ہڈیاں تک نظر آتی ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی خدا نے میرے باپ پر ایک کرم اور کیا کہ اس کی دائیں ٹانگ بائیں ٹانگ سے چھوٹی بنا دی۔ جب کبھی وہ چلتے ہیں، میں "وہ چلتا" یہاں لکھنا چاہتی ہوں۔ لیکن مجھے دنیا والوں کے اخلاق کا پاس ہے۔ جب وہ چلتے تو ایسا معلوم ہوتا ——— جیسے کوئی لنگڑا بھگڑ باجہ رخ۔ خیر۔ یہ میرے باپ کی دوسری شادی ہے، پہلی شادی سے کوئی لڑکا نہ تھا۔ لیکن میرے باپ کو یہ فکر ہوا کہ اتنی جائداد کون سنبھالے گا۔ اتنا بڑا دومنزلہ مکان، ایک کنواں، اتنی زمینیں جو اپنا خون چوس چوس کر خریدی گئی تھیں ان کا کون مالک ہو گا۔ اور پھر دنیا والوں کے طعنے اور کیا طعنے تھے کہ میرا باپ کمزور ہے اس لئے وہ بچّہ پیدا کرنے کے ناقابل ہے۔ لیکن کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک انسان ہو۔ گورنمنٹ سروس

کرتا ہو۔ زمین ہو۔ مکان ہو اور لڑکا نہ ہو۔ اور طعنے۔ مجبوراً میرے باپ نے دوسری شادی کی۔ اور خدا بھلا کرے ان محلّے والوں کا کہ دو لڑکے اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ خدا خدا کر کے لوگوں نے طعنے دینے بند کئے اور متوسط درجہ کا اخلاق بام عروج پر پہنچ گیا۔ میرے باپ کی عزت رہ گئی۔ اور اُجڑا ہُوا گھر بس گیا۔ اکثر میرے ماں باپ میں لڑائی ہُوا کرتی تھی۔ اور وہ لڑائی اکثر رات کے کھانے کے بعد ہُوا کرتی تھی۔ اکثر میری ماں کہا کرتی تھی کہ انہیں اپنی صحت کا خیال نہیں۔ دن رات دفتر کے کام میں لگے رہتے ہیں گھر کا ذرا خیال نہیں بس ایک چپاتی کھا بیٹھ گئے۔ ایک روٹی سے کیا بنتا ہے فروٹ جیوس نہیں پیتے۔ دودھ نہیں پیتے۔ مکھن نہیں کھاتے۔ اور تو کیا تیل کی مالش نہیں کرتے۔ ہمارے پڑوس میں ان ہی کی عمر کے بابو رہتے ہیں۔ کیا نام ان کا۔ بھلا سا نام ہے۔ میں نے ان کی شکل تک بھی نہیں دیکھی۔ مجھے کیا واسطہ ان کی شکل سے۔ لیکن نہایت خوبصورت اور خوش شکل ہیں جسم بھرا بھرا سا، چوڑا چکلا سینہ، بازو موٹے موٹے گٹھے ہوئے۔ اور آنکھیں، آنکھوں میں چمک گال سرخ اور کیا بتاؤں کتنی اچھی صحت ہے! اور میں دل میں سوچتی کہ ماں کو یہ کیسے معلوم ہو گیا۔ ابھی ابھی وہ کہہ رہی تھیں کہ انہوں نے بابو صاحب کی شکل تک نہیں دیکھی لیکن اسوقت تو وہ بابو صاحب کے ہر حصّے کو اسطرح پہچانتی ہیں جیسے انہوں نے ان کا ڈاکٹری معائنہ کیا ہے۔ لیکن یہ سوال کرنا اخلاق سے بعید ہے۔

ازبسکہ تم میری بدصورتی کی وجہ سمجھ گئے۔ یہ وراثت سے ملی۔اس میں میرے ماں باپ کا قصور نہیں کہ انہوں نے کیوں ایک دوسرے سے شادی کی۔ اگر وہ ایک دوسرے سے شادی نہ کرتے تو کوئی اور میری ماں سے شادی کرتا۔ میں اگر حسّاس نہ ہوتی یا خوبصورتی سے مجھے اتنا لگاؤ یا دلچسپی نہ ہوتی تو شاید مجھے اپنے بھدّے پن کا اتنا احساس نہ ہوتا۔اور دور کیوں جاؤں مجھ سے بھدّی لڑکیاں بھی کالج میں تھیں۔لیکن انہیں اپنے بھدّے پن پر اتنا ناز تھا جتنا ایک خوبصورت عورت کو اپنی خوبصورتی پر ہوتا ہے۔ لیکن میں کیا کرتی میرا سوچنے کا ڈھنگ ہی نرالا تھا۔مجھے بدنما چیز اچھی نہیں لگتی۔ مجھے خود اپنے آپ سے نفرت تھی۔گو میں اتنی بدصورت نہ تھی جتنی کہ میں بن رہی ہوں۔اور اگر میں اتنی بدصورت ہوں بھی جتنی کہ میں بن رہی ہوں تو شاید تم میری طرف مائل نہ ہوتے ۔ میری طرف مائل ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں آجتک کسی طرف مائل نہ ہوئی تھی سچ جانو کرہ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد میں مرد کے گرم سانس سے ناآشنا تھی۔اور جب میں بی، ٹی کر چکی تو میری خواہش کچھ مُردہ ہو چکی تھی زندگی کی پیہم شکستوں نے مجھے بے جان کر دیا۔گھٹتے ہوئے ماحول نے امنگوں کا کچومر نکال دیا۔جوانی نہ آئی اور آئی بھی کیونکہ جسم کی ہر رنگینی جذبات کے مسلے جانے سے فنا ہو گئی۔اعصاب پورے طریقے سے نشو و نما نہ پا سکے۔آنکھوں کی چمک کسی انتظار میں میں غائب ہو گئی۔شباب کی رنگینی جو ایک کنواری عورت کے چہرے پہ ہوتی ہے۔آہستہ آہستہ اڑ گئی۔

ہونٹ خشک ہوتے گئے۔ باہنوں پر گوشت نہ چڑھ سکا۔ مجھے ان دنوں کسی
سے محبت نہ تھی۔ لیکن ذہن میں ایک پریشانی دبی رہتی تھی۔ سر پہ ایک جنون
سوار رہتا تھا۔ میرے خیالات اگر متوسط درجہ کے اخلاق پر تولے جائیں تو
مجھے کہنا پڑیگا کہ میرے خیالات ہمیشہ پراگندہ رہتے تھے۔ یہ پراگندگی میرے
جسم کا عصّہ بن گئی۔ میرے جسم کے ہر ذرہ پہ چھا گئی۔ اور پھر آہستہ آہستہ اس
پراگندگی کی یہ تشکیل ہوئی کہ میں اس جوتے کی طرح دکھائی دینے لگی جو عرصہ
تک دھوپ میں پڑا رہنے سے بد وضع اور بیڈول ہو جاتا ہے میرے ذہن
میں خیالات مُردہ ہو چکے ہیں۔ اور پراگندگی کا اثر اعصاب پر پڑ چکا تھا۔
جنسی خواہشیں ایک طرح سے sub limate ہو چکی تھیں۔ یا یوں کہا
جائے کہ جنسی خواہشوں کو ماحول نے ابھرنے نہ دیا تھا۔ لیکن فرائڈ کے کہنے
کے مطابق جنسی خواہش مرتی نہیں۔ دبائی جاتی ہے۔ شاید یہی حالت تھی، گو
احساسات، امنگیں، آرزوئیں ابھر ابھر کر شل ہو چکی تھیں۔ لیکن ایک چنگاری
کسی کونے میں دبی ہوئی تھی۔ میری حالت اس جلے ہوئے اُپلے کی طرح تھی
جو اوپر سے بالکل راکھ دکھائی دیتا ہو۔ لیکن جس کے ——— اندر ہی اندر
چنگاری سلگتی رہتی ہے۔

کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ تم نہ آتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ لیکن پھر خیال آتا ہے
کہ تم نہ آتے تو تمہاری جگہ کوئی اور آجاتا ———————
تم اتنے خوش شکل تو نہ تھے۔ کہ تم مجھے بھا جاتے۔ گو تمہارا قد کافی لمبا تھا، تمہارا
جسم بھرا ہوا تھا لیکن تمہارا چہرہ عجیب بے ڈول سا، بے ڈھنگا سا، یوں مجھے کچھ

بھایا نہیں۔ سچ کہتی ہوں۔ برا نہ مانو۔ اور پھر تم نے میری جانچ پڑتال بھی نہ کی۔ میں پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ تم جیسے لڑکے مجھے ہمیشہ نظرانداز کر دیتے۔ کیوں؟ میں ایک ہی نظر میں بھانپ گئی تھی۔ کہ تمہیں اپنی خوبصورتی کا احساس ہے۔ اور پھر تمہارے دوست بھی کتنے بھونڈے اور بھدے تھے وہی واسدیو اس کی شکل مجھے کبھی نہیں بھولتی۔ وہ مجھے گھور گھور کر دیکھتا تھا۔ اور کئی بار راستہ میں کھڑا ہو ہو کر ہنستا رہتا تھا۔ یا کبھی مسکرا دیتا، یا کبھی اپنے دوست کو آواز دیتا۔ تاکہ میں اس کی طرف دیکھوں۔ اور کتنے ہی جیلے جتن کرتا مگر آجکل کی لڑکیاں یوں نرغہ میں نہیں آتیں۔ اور پھر واسدیو جیسے نامعقول آدمیوں سے انہیں کیا لگاؤ ہو سکتا ہے۔ تم اکثر چپ رہتے تھے۔ یوں ہم تم جیسے تمہیں میرے وجود کا علم ہی نہیں اور نہ ہی میں تمہیں اپنے وجود کا احساس کرانا چاہتی تھی مجھے تم سے محبّت نہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ماحول نے ہم دونوں کو غیر شعوری طور پر ایک دوسرے کے وجود کا احساس کرا دیا۔ یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے وجود کا احساس نہ کرتے اور اس وجود کا احساس دن بدن شدید ہوتا گیا۔ جوں جوں دن گذرتے گئے تمہارا وجود میرے ذہن پر ایک کابوس بنکر چھا گیا۔ اور جب تم اکیلے رہ گئے اور تمہاری اماں کسی ضروری کام سے کسی دوسرے شہر چلی گئیں تو تمہارا وجود میرے لئے ایک بوجھل غبار بن گیا درمیانی طبقے کی گرفت کچھ ڈھیلی نظر آئی۔ اکثر تم مجھے بالکل تنہا اور اکیلے نظر آتے۔ اکثر تم رات کے وقت دیر تک پڑھتے رہتے تھے۔ خیر نہیں کیا

پڑھتے رہتے تھے۔ لیکن یہ مجھے صاف یاد ہے کہ تم اکثر اس وقت بجلی بجھاتے جب میں بیڈ ننگ لیمپ کو بجھاتی۔ میں نے پہلے اس بات کو یونہی نظر انداز کر دیا لیکن بعد میں سوچنے لگی کہ تم کیوں جاگتے رہتے ہو۔ لیکن میں نے کبھی یہ نہ خیال کیا کہ میں کیوں جاگتی رہتی ہوں۔ میں کیوں پہلے نہیں سو جاتی۔ اور کیوں تمہارے لیمپ کی روشنی کی طرف دیکھتی رہتی ہوں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم دونوں ایک ہی لیمپ کی روشنی سے پڑھ رہے ہیں۔ اور جب لیمپ کی روشنی بجھ جاتی اور میرے ارد گرد اندھیرا ہو جاتا تو میں گھبرا جاتی اور میں سوچتی کہ میں اکیلی ہوں اور کبھی آسمان کی طرف دیکھتی جو ستاروں سے اٹا ہوا معلوم ہوتا۔ اور کبھی کبھی کوئی ستارہ ٹوٹتا اور افق کی طرف بھاگتا ہوا چلا جاتا...... اس کے پیچھے پیچھے ایک روشنی کی لکیر آہستہ آہستہ معدوم ہو جاتی۔ دور، محلے کے اس پار کتّے کے بھونکنے کی آواز آتی۔ کتے کے بھونکنے کی آواز چوکیدار کے چلّانے کی آواز میں مدغم ہو جاتی۔ ذہن پر ایک تاریکی چھا جاتی۔ اور میں دیر تک جاگتی رہتی۔ حتیٰ کہ مشرق سے سورج انگارہ بن کر نکل آتا۔ اور اس کی نوکیلی کرنیں میرے پریشان، تھکے ہوئے چہرے پر پڑتیں۔ اکثر میں سوچتی کہ میں اکیلی ہوں، اور تم اس کمرے میں اکیلے ہو، اور پھر ہم دونوں اکیلے ہیں۔ یہ کیوں ہے ایسا کیوں ہے؟ مجھے تم سے محبّت بالکل نہ تھی اور اب بھی نہیں ہے لیکن غیر شعوری طور پر میں تمہاری طرف کھنچی چلی گئی۔

اور پھر اس دن کی بات ہے۔ دن نہیں بلکہ رات تھی، کیا تاریخ تھی؟

نہیں یاد نہ ہوگی مجھے یاد ہے۔ ۱۹ مارچ ۱۹۴۱ء شاید تم اس تاریخ کو بھول گئے ہو گے، لیکن مجھے یہ رات نہیں بھول سکتی۔ اس رات صدیوں کے بنائے قوانین ایک عورت کو نہ جکڑ سکے۔ اس رات مجھے یہی خیال آتا رہا کہ تم اکیلے ہو اور میں تمھارے پاس چلی آؤں اور کہوں کہ آؤ مجھے پیار کرو تو تم کیا کہو گے ہو سکتا ہے کہ اگر تم کسی رات میرے پاس آجاتے تو چیخ اٹھتی اور کہتی کہ یہ چور ہے۔ اس نے میری عصمت کو چھینا ہے۔ لیکن میں تمھارے پاس اکیلی آجاؤں۔ اور میں یہ سوچتے سوچتے پڑھنے لگی۔ لیکن دماغ میں الفاظ پھیلتے چلے گئے۔ اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں ایک بڑی چٹان سے پھسل رہی ہوں۔ تم ابھی تک نہ آئے تھے۔ پہلے تو تم آجاتے تھے۔ آج تم نے کیوں دیر کر دی۔ میری بلا سے ——— میں نے سوچا مجھے کیا پروا۔ تم آؤ یا نہ آؤ۔ میں نے سونے کی کوشش کی لیکن دل جاگنے پر مُصر تھا۔ دل کہہ رہا تھا۔ انہیں آنے دو۔ ابھی آجائیں گے۔ نوکر نے دروازہ بند کر دیا۔ وہی بڑا دروازہ۔ میں نے سوچا۔ اب تمھارے آنے کا کوئی امکان نہیں۔ اب مجھے سو جانا چاہیئے۔ میں نے لیمپ گل کر دیا اور بستر پر دراز ہو گئی۔ آسمان پر تارے میرا منہ چڑانے لگے۔ یہ اندھیرا۔ یہ گھپ اندھیرا روشنی کہیں بھی نہیں۔ گھڑیال نے بارہ بجائے۔ نیچے دالان میں کسی کے خراٹوں کی آواز آنے لگی۔ ساری دنیا سو رہی ہے لیکن میری آنکھوں میں نیند عنقا تھی۔ اور پھر یہ ذہنی پریشانی۔ جیسے کسی دلدل میں میں دھنسی جا رہی ہوں۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ پھر کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں

چپ رہی۔ کُتّا ہوگا۔ میں نے سوچا۔ پھر کسی نے آواز دی۔ یہ تمھاری آواز تھی۔ میں نے سوچا۔ نوکر دروازہ کھول دے گا۔ لیکن تم آوازیں دیتے رہے اور صحن سے خراٹوں کی آواز آتی رہی۔ میں نے سوچا۔ کیوں نہ میں دروازہ کھول دوں۔ ہاں ہاں، دروازہ کھول دو۔ دل نے کہا اور میں چپکے سے اٹھ کر نیچے چلی گئی۔ اور دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی تم نے ٹارچ جلائی جیسے کوئی بھولا بھٹکا راستہ ڈھونڈھ رہا ہو۔

"ادھر اوپر" میں نے زیر لب کہا۔ دل دھک دھک کرنے لگا۔ ٹانگوں میں ایک بجلی کی لہر دوڑ گئی۔ کنپٹیاں جلنے لگیں اور گلے سے ایک لیس دار لُعاب نکلتا ہوا معلوم ہوا۔ اور پھر۔ تاریکی ...... اس تاریکی میں کیا ہوا۔ یہ تم جانتے ہو۔ شاید تم اس سے پہلے کسی عورت سے ہمکنار ہو چکے ہوگے۔ لیکن میرے لئے یہ پہلا موقع تھا۔ تمھارے ہونٹ خنک اور باسی تھے اور ان میں بیئر کی خوشبو آ رہی تھی۔ اس دن مجھے معلوم ہوا کہ تم بیئر بھی پیتے ہو۔ میں اس دن زندگی کی مٹھاسوں سے آشنا ہوئی۔ تمھارے وجود نے جو میرے جسم سے ہمکنار تھا میری روح پہ ایک نشہ طاری کر دیا۔ اور تم دیر تک میرے پریشان بالوں سے کھیلتے رہے۔ میں نے تمھارے ہونٹوں کو چوما۔ تمھارے گالوں، تمھاری گردن، حتیٰ کہ میں تمھاری گردن چوم چوم کر چُور ہو گئی۔ اور سچ کہتی ہوں ابتک تمھارے ہونٹوں کا مزا میرے ہونٹوں پر موجود ہے۔ ابھی تک میرے ذہن میں تمھارے جسم کی بسا ند تر و تازہ ہے، جنگلی شہد کی طرح تر و تازہ شیریں اور گرم۔

دور آسمان پر تارے مسکرا رہے تھے۔ ہوا میں ایک نیند سی رچی ہوئی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ تمام دُنیا اسیطرح سوتی رہے اور یہ رات ایک مسلسل رات بن جائے۔ مجھے کتنا سکون نصیب ہوا، مجھے کتنی خوشی ہوئی اسے میں ہی جانتی ہوں۔ چاہے تو اسے مٹتے ہوئے شباب کی تاثیر سمجھ لو۔ یا ایک جوان عورت کی بیوقوفی کا مُرقع، لیکن وہ ضرور خوشی کے لمحے تھے۔ مجھے زندگی بھر کبھی اتنی مسرّت حاصل نہ ہوئی تھی۔ میری زندگی کے تار کبھی اس طرح کانپے نہ تھے۔ اس دن تم نے مجھ سے محبّت کر کے اس لازوال مسرّت کی لذّت سے آشنا کر دیا۔ کیا اچھا ہوتا کہ یہ محبت جاودانی ہو جاتی۔ یہ رشتہ ہمیشہ کے لئے پکّا ہو جاتا لیکن ایسا نہ ہوا، دن گذرتے گئے۔ اور مجھے اپنی وحشیانہ غلطی کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ میں نے تم سے کہا کہ تم میری مدد کرو۔ تم نے انکار کر دیا۔ مجھے تمھارے انکار سے حیرت نہیں ہوئی۔ مجھے امید تھی کہ تم ایسا ہی کرو گے۔ اور پھر ایسا کیوں ہو۔ کیا دُنیا میں کبھی ایسا نظام نہ ہوگا۔ جہاں مرد اور عورت تاروں کی چھاؤں میں اکٹھے رہ سکیں گے! اور دُنیا کے یہ بنائے ہوئے قانون کبھی رخنہ انداز نہ ہو سکیں گے۔ جس صبح میں بھاگی اس وقت چاروں طرف میلا میلا اندھیرا تھا۔ ہوا میں اسی گھٹے ہوئے ماحول کی بدبُو آ رہی تھی اور آسمان پہ چاند یاس وحسرت کا مُرقع بنا ہوا تھا یکایک چاند پر سیاہ بادل چھا گئے اور چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ کسی نے مجھے نہ بلایا۔ اور تم کہاں تھے؟ میں نے سوچنے کی کوشش کی۔

میں اب کہاں ہوں اور کیا کرتی ہوں شاید تم جاننا چاہو؟ میں ایک معمولی سے اسکول میں استانی ہوں اور میرے ایک بچّہ ہے۔ ایک چھوٹا سا پیارا بچّہ۔ اس کی آنکھیں تم سے ملتی ہیں۔ لیکن تمہیں اس سے کیا غرض!

کبھی کبھی وہ آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر کہتا ہے ماں۔ ابا؟ ابا؟ اور میں کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ کیا ہی اچھا ہو کہ اس دنیا میں نہ مائیں ہوں اور نہ باپ صرف انسان اور بچّے۔

خلا

جب وہ ایم۔ اے پاس کر چکی تو اس نے اپنی زندگی کا جائزہ لیا۔ ان چند برس میں وہ کیا سے کیا ہو گئی تھی۔ سامنے دیوار پر اس کی چھ سال پہلے کی تصویر لٹک رہی تھی۔ دیوار پر ہلکے سبزی مائل رنگ کا روغن ہو رہا تھا اور بجلی کے نیلے قمقمے کی روشنی میں کمرے کی چھت نیلے آسمان کی طرح پھیلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اسے اس تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے ایسا معلوم ہوا گویا وہ ایک جل پری کو دیکھ رہی ہے۔ جو اس کمرے کی نیلی فضا میں سما گئی ہے اور وہ ایک اجنبی کی طرح کمرے کی ہر چیز کو گھور گھور کر دیکھ رہی ہے۔ اور جب کلاک نے نو بجائے تو اس نے محسوس کیا کہ اس کے دماغ پر نو کاری ضربیں لگ رہی ہیں۔ ماضی کے دھندلے سائے میں اُسے

اُس وقت کی تصویر نظر آئی۔ جب وہ پہلی بار کالج میں داخل ہوئی تھی۔ وہ یہ سوچتے ہی قدِ آدم آئینے کے سامنے آ گئی۔ اپنے چہرے کی طرف دیکھتے ہی اس کے لب کھل گئے اور دودھ جیسے سفید دانت چمکنے لگے۔ سوائے اس کے کہ اپنی زندگی پر ایک بلند قہقہہ لگائے۔ وہ اور کیا کر سکتی تھی۔ اُف وہ کیا سے کیا ہو گئی تھی! چھ سال پہلے اس کی شکل بالکل اس لڑکی سے ملتی تھی۔ جو اس وقت اس لکڑی کے چوکھٹے میں بند ہے۔ بالکل ایسے ہی خد و خال، بھرا ہوا جسم۔ ایسی ہی جھکی جھکی سی آنکھیں۔ سینے میں اتنا ہی تناؤ۔ اور قد میں ایسی ہی رعنائی، اسے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ جب کالج میں پہلی بار گئی تھی۔ اور اُس نے نوجوان لڑکوں کے ہجوم کو دیکھا تھا تو اس کے گال جوانی کی حدّت سے تمتما اُٹھے تھے۔ اسے اچھی طرح یاد ہے کہ لڑکے کس طرح اس کا تعاقب کیا کرتے تھے۔ وہ اکثر تانگے میں بیٹھ کر گھر جایا کرتی تھی اور لڑکے سائیکلوں پر سوار ہو کر اسے کوٹھی تک پہنچا آیا کرتے تھے۔ اکثر وہ لڑکوں کی طرف دیکھتی ہی نہ تھی! اور کبھی کسی خوبرو لڑکے کی طرف دیکھ کر اور اپنے حسین ہونٹوں کو جنبش دے کر اس کی راتوں کی نیند حرام کر دیا کرتی تھی۔ کالج میں اکثر لڑکے اس کے قریب سے ہو کر گذرتے تھے۔ اور آہیں بھرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے تھے۔ اور جب وہ کلاس روم میں بیٹھتی تو کئی لڑکے اسے اس طرح ٹکٹکی لگا کر دیکھتے تھے کہ مجبوراً اسے وہاں سے اٹھ جانا پڑتا تھا۔ ہاں۔ اسے اچھی طرح یاد ہے کہ کئی لڑکوں نے اسے محبت بھرے خط لکھے تھے۔ لیکن وہ کسی ایسے خط

کا جواب نہیں دیا کرتی تھی۔ اور پھر وہ معصوم سا لڑکا اسے بھا گیا۔ بالکل شرمیلا سا، ادا، میانہ قد۔ گول سا چہرہ۔ اور چھریرا بدن۔ وہ اکثر اس کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا کرتا تھا۔ اور اکثر اسے بھی ان معنی خیز نگاہوں کا جواب دینا پڑتا تھا۔ یونہی مہینہ بھر وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے تھے۔ لیکن دونوں میں کسی کو جرأت نہ ہوتی تھی کہ ایک دوسرے سے بات تک کر سکتے۔

کبھی کبھی وہ اس کے قریب سے ہو کر گزر جاتا۔ اور دور جا کر اس کی طرف دیکھتا رہتا۔ ایک بار کالج میں کسی بڑے آدمی کا لکچر تھا۔ پرنسپل صاحب کے حکم سے سب طالبہ کو کالج ہال میں جانا پڑا تھا۔ اور وہ بھی کالج ہال میں جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ کچھ دیر کے بعد اس نے دیکھا کہ وہی لڑکا اس کے ساتھ والی کرسی پر آ بیٹھا۔ وہ اسے اپنے اس قدر قریب دیکھ کر سہم سی گئی۔ کچھ عرصے کے بعد اس نے کسی کا ہاتھ اپنے سے مس ہوتے محسوس کیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ بدن میں بجلی کی رو دوڑنے لگی۔ اور اُس نے اپنا ہاتھ یک بارگی کھینچ لیا۔ اور جب لکچر ختم ہؤا تو لڑکے نے قریب ہو کر کہا۔ "معاف کیجئے میرا ہاتھ غلطی سے آپکے ہاتھ سے چھُو گیا تھا" وہ کچھ جواب دینا چاہتی تھی کہ گلے میں کوئی چیز چبھتی ہوئی محسوس ہوئی اور وہ خاموش بُت کی طرح کھڑی رہی۔ لڑکا اتنا کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ لیکن کیسی عجیب بات تھی کہ اس کے بعد اُس نے اس لڑکے کو کالج میں نہیں دیکھا۔ وہ اس کا نام تک نہیں جانتی تھی۔ وہ کہاں سے آیا تھا اور کہاں غائب ہو گیا۔ وہ کافی عرصے

تک اسے یاد کرتی رہی۔ لیکن آہستہ آہستہ اس یاد کے نقوش مدھم ہونے لگے۔ اور پھر بالکل معدوم ہو گئے۔

اور جب وہ بی۔اے میں داخل ہوئی۔ تو اس کی رُکی ہوئی زندگی میں ایک ہیجان سا پیدا ہونے لگا۔ اسے اس وسیع کرۂ ارض کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اسے پڑھنے کا شوق تھا۔ اور اُس نے تھوڑے سے عرصے میں دُنیا کے مشہور افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں کی کہانیاں اور ناول پڑھ لئے آہستہ آہستہ اُن کے خیالات اس کے دماغ پر چھا گئے۔ اُس کی پرورش کچھ اس طرح سے ہوئی تھی کہ وہ عام شاہراہ سے ہٹ کر چل رہی تھی۔ اگر وہ چاہتی تو اس عمر میں ہی کسی اچھے سے لڑکے سے اس کا بیاہ ہو جاتا۔ کیونکہ اُس کے پاس روپے کی کمی نہ تھی۔ اور خود بھی حُسن و جمال کی دولت سے مالا مال تھی۔ باپ ایک اچھے عہدے پر فائز تھا۔ اور دادا لاکھوں کی جائداد چھوڑ کر مرا تھا۔ اس کے لئے لڑکوں کی کمی نہ تھی۔ لیکن اس کی دماغی تربیت عام شاہراہ سے کچھ ہٹ کر ہوئی تھی۔ اس نے سوچا کر کچھ دیر اور پڑھا جائے اور علم کی وسیع پہنائیوں میں کھو کر اپنی دماغی قوتوں کو بڑھایا جائے۔ آخر ایسا کیوں ہو کہ جوں ہی لڑکی سنّ بلوغ کو پہنچے۔ اس کی شادی کر دی جائے کیا عورت کا کام صرف بچّے جننا ہی ہے۔ وہ ایک مشین کا پرزہ بننا نہیں چاہتی اور نہ عام عورتوں کی طرح اپنے آپ کو ایک مرد کے حوالے کر دینا چاہتی ہے وہ علم کی وسیع گہرائیوں میں اپنے آپ کو ڈبو دینا چاہتی ہے۔ وہ آسمان کی نیلاہٹ کو پا لینا چاہتی ہے۔ وہ دل و دماغ کے اندر زندگی کے تمام

اسرار کو پالے گی اور قدرت کے اس لازوال حسن کی تہہ تک پہنچے گی۔ وہ ایک عام عورت نہیں ہے ....

اور اس طرح زندگی کے دو سال اور گذر گئے۔ اس کا مطالعہ وسیع ہوتا گیا۔ لیکن اس کے دل و دماغ پر ایک نامعلوم سی اُداسی چھا گئی۔ جوں جوں وہ اس دنیا کے قریب ہوتی گئی۔ اُسے دنیا محدود اور چھوٹی دکھائی دینے لگی۔ اُس نے محسوس کیا کہ دنیا کے ہر گوشے میں ایک ہی قسم کے لوگ بستے ہیں۔ وہی حسد، وہی کینہ۔ وہی سینہ زوری وہی بے بسی۔ اور لاچاری وہی بھوک، آخر دنیا ایسی کیوں ہے۔ کیوں کچھ لوگ عیش کرتے ہیں اور باقی بھوکے رہتے ہیں۔ وہ اکثر ان سوالات پر غور کرتے کرتے بے چین ہو جاتی اور کبھی کبھی اُسے خیال آتا کہ وہ لامذہبیّت اور دہریّت کی طرف جا رہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان دو برس میں اس کی ذہنی قوتوں میں بہت اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کی گفتگو میں عقلمندی جھلکتی تھی۔ اُسکی باتوں میں ایک روانی تھی۔ وہ خوش گفتار اور با مذاق ہو گئی تھی۔ لیکن اُس کا دل ایک ناقابل بیان بوجھ سے دب رہا تھا۔ اسے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس نے اس ڈگری کو حاصل کرنے میں دنیا کی عزیز ترین چیز کھو دی ہے۔ اور شاید یہ تھا اُس کا حُسن و شباب۔

ان چھ برس میں اس کی کایا پلٹ گئی تھی۔ اس کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ چکے تھے۔ اُس کی آنکھیں جو اُسے سب سے زیادہ پسند تھیں۔ اب کھنچی کھنچی سی رہتی تھیں۔ نہ ان میں وہ پہلی سی دلکشی

تھی نہ چمک۔ جب وہ ہنستی تھی۔ تو اس کی آنکھوں کے گرد سلوٹیں سی پڑ
جاتی تھیں اور ماتھے پر ایک دو بڑی بڑی لکیریں پیدا ہو گئی تھیں۔ اس کی
چال میں ایک قسم کی نقاہت آ گئی تھی وہ اب اس مسافر کی طرح تھی۔ جس نے
بہت دور دراز کا سفر طے کیا ہو اور جسے منزل نہ دکھائی دیتی ہو۔ وہ
سوچنے لگی کہ وہ کتنی پاگل ہے۔ نسیم، بلقیس اور شمیم اسی کے ساتھ تو پڑھا
کرتی تھیں۔ لیکن انہوں نے کیوں اتنی جلدی شادی کر لی۔ نسیم چودہ
ہی سال کی تھی۔ جب اس نے پڑھنا چھوڑ دیا۔ ماں باپ نے اس کا بیاہ ایک
شریف گھرانے میں کر دیا تھا۔ اسے نسیم کیسی پیاری معلوم ہوتی تھی۔ نسیم
کو شروع ہی سے پڑھائی سے نفرت تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اسے ایک حسین
اور صاحبِ ثروت خاوند ملے۔ ایک عالی شان کوٹھی رہنے کے لئے۔ پہننے
کے لئے قیمتی اور خوبصورت کپڑے۔ اور اندر باہر نوکر چاکر اور یہی کچھ ہوا۔
اس نے جو چاہا۔ اسے وہی ملا۔ ابھی چند دن ہوئے جب نسیم اسے ریگل سینما
میں ملی تھی۔ جب وہ کار سے اتری تو وہ اسے پہچان بھی نہ سکی تھی۔ اُس نے
آسمانی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ لبوں پر ہلکی سی سُرخی اور شانوں پر
لمبی لمبی لٹیں لٹک رہی تھیں۔ پہلے وہ اسکے چہرے کا ایک رُخ ہی دیکھ
سکی تھی۔ بائیں کان میں ایک سفید سا آویزہ لرز رہا تھا۔ اور ایسا معلوم
ہوتا تھا جیسے چاند غلطی سے نسیم کے کان میں اٹک کر رہ گیا ہے۔ کتنی خوش
و خرّم تھی وہ۔ کتنا سکون حاصل تھا اُسے۔ اور وہ خراماں خراماں ہال کے
اندر چلی گئی تھی۔ دو بچّوں کی ماں ہونے پر بھی وہ خوش و خرّم تھی۔ شاید

وہ سمجھتی تھی کہ عورت کا واحد مقصد بچے جننا ہے۔ اور بلقیس با شوخ و طرار جیسے ہر شخص سے لڑنے میں لطف آتا تھا۔ یوں ہی اِدھر اُدھر کی باتیں کیا کرتی تھی اور اسے فلمیں دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جب کوئی نئی فلم آتی تو وہ کہتی "بہن ثریا۔ آؤ پکچر دیکھنے چلیں۔ خدا کی قسم غضب کی پکچر ہے۔ گانے سنو تو مبہوت رہ جاؤ"۔ اس نے بھی ایف۔ اے کر کے شادی کر لی۔ اور اس طرح شمیم نے بھی اپنا رفیق ڈھونڈھ لیا تھا۔ اور جب کبھی وہ ان لڑکیوں سے ملتی تو اس نے کبھی اُن کے مُنہ سے شکایت کی، بات نہیں سنی۔ شاید شادی کا دوسرا نام سکون ہے۔

ہاں اسے اچھی طرح یاد ہے کہ کئی بار لوگ اسے بھی دیکھنے آتے تھے اور ایک صاحب کی شکل تو اسے قیامت تک نہ بھولے گی۔ ہاں وہی کالے کلوٹے سے جو اپنے آپ کو آئی سی ایس اور خدا جانے کیا کیا کہتے تھے نہایت بے باک اور چالاک معلوم ہوتے تھے۔ کہتے تھے تمام یورپ کی سیر کر چکا ہوں اور ہندوستان میں میرا جی نہیں لگتا۔ بھلا ہندوستان بھی کوئی ملک ہے۔ یہاں کی عورتیں پردہ کرتی ہیں۔ میل ملاقات سے ڈرتی ہیں یہاں کی سڑکیں شکستہ۔ انسان غیر مہذب۔ بات کرنے کی تمیز نہیں ثریا انسان پیدا ہو تو یورپ میں۔ یہ ملک تو جہنّم ہے جہنّم۔ کاش ان کی شکل اچھی ہوتی۔ او نہہ شکل اچھی ہوتی تو کیا وہ اُن سے شادی کر لیتی؟ کبھی نہیں۔ وہ اسے بالکل ناپسند تھے۔ کہنے لگے "ثریا —— آپ کو کونسا

ناولسٹ پسند ہے۔" اس نے کہا تھا۔ ڈی۔ ایچ۔ لارنس۔ یہ جواب سُنکر وہ فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ایسا معلوم ہوُا جیسے ان کے جسم سے گرم سلاخ لگا دی گئی ہے۔ " لارنس ——— ثریّا تم لارنس پڑھتی ہو! اخلاق سے گرا ہوُا ادیب بیہودگی کا پلندہ۔ وہ ——— پھر وہ تو سراسر عورتوں کی تفضیحک کرتا ہے۔ آپ ——— آپ کی طرح ......" انکے دانت کتنے میلے تھے جیسے ساری عمر بُرش نہ کیا ہو۔

اور پھر وہ ٹینس کے کھلاڑی آئے۔ انڈیا نمبر ون۔ کیا نام تھا اُن کا۔ بھلا سا نام تھا۔ خیر مجھے نام سے کیا غرض۔ خوب موٹے تازے۔ جیسے عید کے لئے بکرا پالا جاتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو شادی کے لئے تیار کر رہے تھے۔ ان کے چہرے سے وحشت ٹپکتی تھی۔ آنکھوں میں بے حیائی ان کی آنکھوں سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ان کے سامنے ایک نہایت ہی لذیذ پلیٹ پڑی ہوئی ہے۔ جیسے وہ کھانے کے لئے بے قرار ہو رہے ہیں بھلا وہ ان سے کس طرح شادی کر سکتی تھی۔

کھلاڑی صاحب کہنے لگے "کیا آپ کو ٹینس کھیلنے کا شوق ہے؟"

"جی نہیں!"

"کیا آپ صبح سیر کرنے جاتی ہیں؟"

"جی نہیں!"

"کیا آپ۔ میرا مطلب ہے، ورزش کرتی ہیں؟"

"جی نہیں!"

وہ میری "جی نہیں" کو سنکر کچھ کھسیانے سے ہو گئے۔ اور مڑکر ریکٹ ہلانے لگے۔ جیسے ریکٹ کو امداد کے لئے بلا رہے ہوں۔ اور پھر ثریا نے ان سے پوچھا تھا کہ "آپ ہارڈی کے متعلق کیا جانتے ہیں؟"

"میں نے ہارڈی پڑھا ہی نہیں"

"ہارڈی نہیں پڑھا" وہ یہ جواب سنتے ہی جل بھن کر کوئلہ ہو گئی تھی۔ بھلا جس شخص نے ہارڈی نہیں پڑھا۔ اس نے کیا پڑھا ہے۔ وہ کس طرح اس شخص سے شادی کر سکتی تھی اور اس طرح اس نے کئی امیدواروں کو ٹھکرا دیا وہ اکثر سوچتی تھی کہ وہ کیوں شادی کرے۔ کیا زندگی کا مقصد صرف شادی کرنا ہے۔ اور کیا عورت کا یہی کام ہے کہ وہ ہر سال ایک بچہ پیدا کرے وہ ایسا نہیں کرے گی۔ وہ اپنی انفرادی حیثیت کو قائم رکھے گی۔ اور اس انفرادیت کو قائم رکھنے کے لئے ہر قربانی کرنے کے لئے تیار رہے۔ اور اسی عزم کو لے کر وہ ایم۔ اے میں داخل ہوئی لیکن ان دو سالوں میں اس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری رہی۔ اکثر وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتی اس کا جی چاہتا کہ وہ کسی انسان سے بات کرے جو در اصل انسان ہو یہ کالج کے لڑکے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ ان کا عشق بھی نرالا۔ برسوں کی غلامی نے ان کے عشق کو بے زبان کر دیا ہے۔ یونہی ہمیشہ لڑکیوں کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھیں گے۔ نہ منہ سے بولیں گے۔ نہ سر سے کھیلیں گے۔ بہت ہوا تو کسی سے کندھا بھڑا دیں گے۔ کسی کو سنا کر واہیات سا مذاق کر دیں گے۔ یا کبھی کبھی کسی

لڑکی کے سامنے سے گذرتے ہوئے کھانس دیں گے۔ یہ سب حرکات
اُن گونگے انسانوں کی طرح کی جاتی ہیں جن کی زبان سی دی گئی ہے۔
جن کی ذہنی قوتیں برسوں کی غلامی سے کند ہو گئی ہوں۔ اور جنکی زندگیاں
بے لذّت اور تلخ ہو گئی ہوں اد نہہ۔ گونگے عاشق . . . . .

اور آجتک اس سے کوئی مرد یہ نہ کہہ سکا یا کسی کالج کے لڑکے کو
اتنی اخلاقی جرأت نہ ہوئی۔ جو آزادانہ طریق پر اُس سے کہہ سکتا "میری
ثرّیا۔ موسم کتنا خوشگوار ہے۔ ہوا کیسی ٹھنڈی اور سکون بخش ہے۔
پھولوں میں کتنی تازگی ہے اور ہرے ہرے پتوں میں کتنی چمک ہے
اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر طرف بہار کی دلہن اپنے ہاتھوں سے حسن
بکھیر رہی ہے یہ لانبے لانبے درخت۔ یہ خوبصورت اور حسین پرندے یہ
پھیلا ہوا نیلا آسمان۔ یہ سورج کی کرنیں یہ سب حسن کس کے لیئے
ہے آؤ میری ثرّیا، محبت کریں" لیکن ان لوگوں میں اتنی جرأت کہاں
کاش ——— ان لوگوں میں اتنی طاقت ہوتی کہ وہ اپنے دلوں کو محبّت
کی سچی آگ سے روشن کر سکتے۔

اور پھر اُسے معلوم ہوا کہ وہ جو کچھ چاہتی ہے۔ وہ ایک آرزوئے
ناکام ہے۔ اس کے حسین خوابوں کو ایک جھٹکا لگا۔ اور اس کے دل
کی اداسی بڑھنی گئی۔ وہ سوچتی تھی۔ وہ سمجھنا چاہتی تھی کہ اسے کیا ہو گیا ہے

وہ کیا چاہتی ہے۔ کیا اُسے مردوں سے نفرت ہے۔ کیا وہ کسی مرد سے شادی نہیں کرے گی۔

وہ کبھی کبھی رات کے گہرے اندھیرے میں جاگ اُٹھتی۔ اسے اپنا سانس گھٹتا ہُوا معلوم ہوتا۔ اس کے سارے جسم میں ایک ہلکا سا درد ہوتا۔ ایک میٹھی میٹھی جلن اور آنکھوں میں ہلکا سا خمار۔ وہ سوچنے کی کوشش کرتی کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ اب وہ ناول نہیں پڑھ سکتی تھی۔ اسے ان ناولوں کو پڑھکر اور بھی کوفت ہوتی تھی۔ اور جب کبھی وہ اپنی زندگی کا تجزیہ کرتی تو اُسے معلوم ہوتا کہ اس کی زندگی محبت سے خالی رہی ہے۔

اور پھر یکایک اس کی زندگی میں مسعود آگیا تھا۔ اسے ایسا معلوم ہُوا جیسے عرش سے تارا ٹوٹا ہے۔ اور فضا کو چیرتا ہُوا اُس کے گھٹتے ہوئے ماحول میں داخل ہو گیا۔ جوں ہی مسعود اس کی زندگی میں وارد ہُوا اس نے جانا کہ اس نے زندگی کا منتہائے مقصود پا لیا ہے۔ جیسے ایک لمبے دریائی سفر کے بعد زمین کا کنارہ آگیا ہے۔ وہ بے دھڑک اس سے ملا کرتی۔ اور گھنٹوں باتیں ہوتیں۔ نہایت عجیب انسان تھا وہ زندگی بھر اس نے ایسا خوش خلق انسان نہیں دیکھا تھا۔ لبوں پر ہر وقت مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک، سب سے پیاری اس کی مسکراہٹ تھی۔ اُس کی مسکراہٹ ایک بچے کے تبسّم کی

طرح معصوم تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اس کے پاس بیٹھی رہے اور اس کی باتیں سنتی رہے۔ مسعود خاصہ پڑھا لکھا تھا۔ دنیا کے مشہور آرٹسٹوں کی کتابیں پڑھ چکا تھا۔ اور ان پر بے تکلف بحث کر سکتا تھا۔ نہ ہندو لگتا تھا نہ مسلمان۔ صرف انسان معلوم ہوتا تھا۔ اس کی شخصیت میں ایک بے پناہ کشش تھی۔

وہ اس مقناطیس کی طرح تھا۔ جس کی طرف لوگ خود بخود کھنچے آتے تھے۔ اور ثریا کو اس سے ایک گونہ عشق سا ہو گیا تھا۔ لیکن جب کبھی محبت کے متعلق بات چھڑتی تو نہایت بھولے پن سے کہہ دیتا کہ محبت میں مجھے یقین نہیں۔ محبت دراصل ایک بنیادی جذبہ ہے۔ محبت نہ حقیقی ہوتی ہے نہ مجازی۔ محبت صرف جسمانی ہوتی ہے۔ اسے محبت کہہ لیجئے یا کچھ اور۔ اور پھر پر معنی مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھ لیتا اور کہتا "بتاؤ ثریا۔ تمہاری کیا رائے ہے"۔ ثریا بچاری کیا جواب دیتی۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ اس سے باتیں کرتا رہے۔ اور وہ اُس کی باتیں سنتی رہے۔ اس کی باتوں میں کتنا رس تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ ہمیشہ اس کے پاس بیٹھی رہے۔ ایک دن مسعود نے کہا۔

"ثریا تم شادی کیوں نہیں کرتیں"؟

"مجھے مردوں سے نفرت ہے"۔

"اوہ ــــــ"

"اور آپ شادی کیوں نہیں کرتے"؟

"مجھے عورتوں سے نفرت ہے"
اور پھر وہ دونوں مسکرانے لگے۔

جس دن وہ مسعود کے گھر نہ جاتی۔ اس کا دل بے چین ہو جاتا۔ وہ گھر والوں سے لڑتی۔ نوکروں کو گالیاں دیتی۔ چھوٹے بھائیوں کو جھڑکتی اور جب تک وہ مسعود کو نہ مل لیتی۔ اسے سکون حاصل نہ ہوتا۔ مسعود کے آنے سے اسکی زندگی میں جو خلا تھا۔ وہ پُر ہو گیا تھا۔ لیکن آجتک اس نے مسعود سے کبھی محبت کا اظہار نہ کیا تھا۔ اور نہ ہی مسعود سے کبھی کوئی ایسی حرکت سرزد ہوئی جس سے وہ اندازہ کر سکتی کہ مسعود کو اس سے ... محبت ہے۔ بلکہ وہ تو محبت میں یقین ہی نہیں رکھتا۔ وہ اس سے کیوں محبت کرنے لگا تھا لیکن جسمانی محبت ——— آخر انسان ہے۔ ثریّا چاہتی تھی کہ وہ مسعود سے اپنے دل کا حال بیان کر دے۔ بھلا اس میں ہچکچاہٹ کیوں ہو۔ آخر کونسی بڑی بات ہے، یہی ہو گا کہ وہ انکار کر دیگا۔ لیکن انکار کا لفظ ذہن میں آتے ہی ثریّا کے بدن میں ایک جھرجھری سی پیدا ہو جاتی وہ سمجھتی کہ اگر مسعود نے ٹال کر دی تو ہاں کون کریگا۔ اور اس ہاں پر اُس کی زندگی کا دارومدار تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ساحل سے کشتی ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے۔

اس شام ثریّا نے عزم کر ہی لیا کہ وہ اپنے ارادے سے مسعود کو باخبر کر دے گی۔ ثریّا نے اپنی بہترین ساڑھی نکالی قدِ آدم شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے اپنے ہونٹوں کو رنگین کر لیا۔ آنکھوں میں ہلکا سا کاجل لگایا

——— اور ناخنوں پہ پالش کیا۔ ثریّا نے اپنے سر کو جنبش دی۔ اسکی کالی کالی لٹیں اسکے شانوں پر بکھر گئیں۔ آج زندگی میں آخری بار وہ اپنے آپ کو داؤں پر لگانا چاہتی تھی۔ اگرچہ اسے معلوم تھا کہ مسعود شوخ اور بھڑکیلے کپڑے پسند نہیں کرتا۔ لیکن اُس نے سوچا آج وہ پورے ٹھاٹ سے کپڑے پہنے گی وہ شباب کو دوبارہ زندہ کرے گی اور جوانی کی بکھری ہوئی رعنائیوں کو ایک بار پھر اکٹھا کرے گی۔ تاکہ دل میں ارمان نہ رہے۔ شک کی گنجائش نہ رہے۔ اسے معلوم تک نہ ہوا کہ وہ کب اور کس طرح مسعود کے گھر پہنچی مسعود آرام کرسی پہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے بال پریشان تھے۔ اور اس کے لبوں پر ایک حزیں سی مسکراہٹ تھی۔ ثریا کو دیکھتے ہی اس کی باچھیں کھل گئیں اور بے معنی مسکراہٹ اس کے لبوں پر ناچنے لگی۔ مسعود نے ثریا کو سر سے لے کر پیر تک دیکھا۔ جیسے جوہری ایک موتی کو پرکھتا ہے اور مسعود نے کتاب کو میز پر رکھتے ہوئے کہا، "کتنا خوشنما موتی ہے!"

"جوہری نہیں ملتا" ——— ثریّا نے جواب دیا۔ اسکی آواز میں ارتعاش تھا۔

"اِس دنیا میں جوہری کم ملتے ہیں ثریّا" اور پھر وہ چھت کی طرف دیکھنے لگا جیسے کسی گمشدہ چیز کو تلاش کر رہا ہو، اور اُس نے ایک لمبی آہ بھری۔ اور پھر یکایک مسکرانے لگا، ثریّا کو ایسا معلوم ہوا۔ کہ وہ رونا چاہتا ہے۔ لیکن رو نہیں سکتا، یہ ہنسی خوشی ظاہر نہیں کرتی۔ بلکہ ایک گہری اداسی کا پرتو ہے۔

وہ کہنے لگا "ثریا تم میری زندگی میں بہت دیر کے بعد آئی ہو، کاش کچھ عرصہ پہلے ملاقات ہوتی۔"

وہ کچھ جواب دینا چاہتی تھی ۔ کہ ساتھ والے کمرے میں آہٹ ہوئی دروازہ کھلا ۔ اور ایک موٹی بھدّی سی عورت کمرے میں داخل ہوئی ۔

" ان سے ملئے ۔ میری بیوی ہیں ۔ آج صبح کی گاڑی سے اپنے میکے سے آئی ہیں ۔ اور آپ ہیں مس ثریّا "

اور جب ثریّا مسعود کے گھر سے نکلی تو اسے محسوس ہؤا کہ وہ اپنی امیدوں کے جنازے کو دفنا کے آئی ہے ۔ چاروں طرف رات کی سیاہی پھیل چکی تھی دور سڑک پر بینڈ بج رہا تھا ۔ دولھا گھوڑے پر چڑھا ہؤا تھا ۔ اور لمبی لمبی قطاروں میں موٹریں بھاگی جا رہی تھیں ۔ سڑک کے دونوں طرف درخت چپ چاپ کھڑے تھے ۔ اور بجلی کے قمقمے اس کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے ۔ اور یکا یک ثریّا کو معلوم ہؤا کہ وہ آج دلہن بن کر کنواری رہ گئی اور شاید یہ کنوارپن ہمیشہ کے لئے اُس کا ساتھی بن جائے ۔
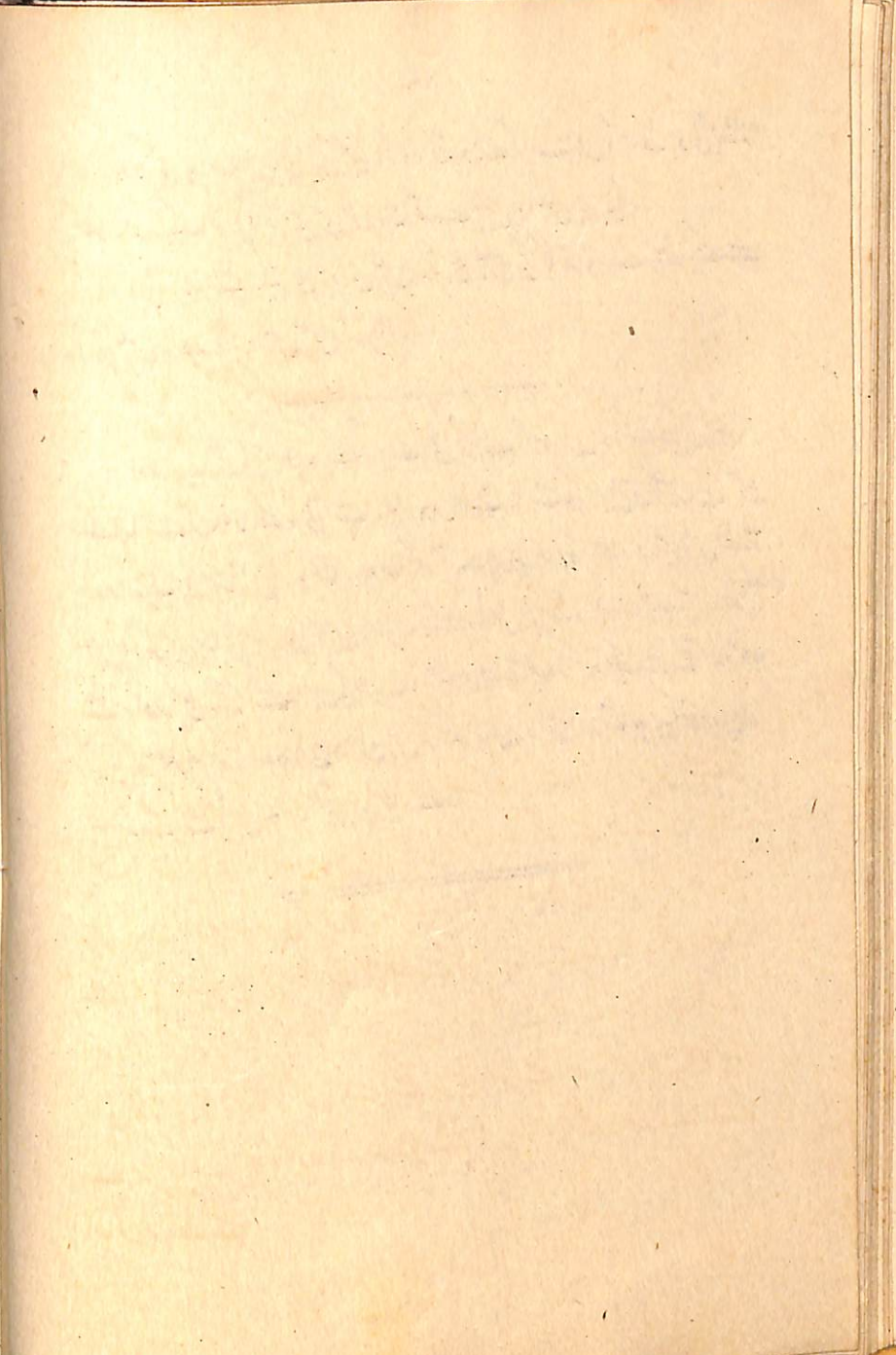
ریاضت

ایسا کیونکر ہُوا، وہ سوچنے لگا، اُس کے دماغ نے پندرہ برس پہلے کی طرف زقند لگائی۔ جب وہ بیس سال کا تھا، اور گھر سے بھاگ کر آیا تھا۔ یہی پلیٹ فارم تھا۔ یہی ریل کی پٹڑی، مسافر اسیطرح اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ قلی اسیطرح "قلی صاحب قلی چاہیئے قلی"، پکار رہے تھے۔ اب بھی اسیطرح ایک فرنگی اور اس کی بیوی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے پلیٹ فارم پر آنے والی گاڑی کا انتظار کر رہے تھے۔ یہی سوچتے سوچتے وہ اپنی انگلیوں سے سر کھجانے لگا، اور یاد کے جھروکے میں ماضی کے دُھندلے سائے اجاگر ہونے لگے۔

بھیروجی کا مندر ایک ٹیلے پر کیکروں کے جھنڈ میں گھرا ہوا تھا۔ اُس کا بوڑھا باپ مندر کا پجاری تھا۔ لیکن دراصل بوڑھے باپ نے مندر کا سب کام اپنے جوان بیٹے کو سونپ دیا تھا۔ مندر کے دالانوں میں جھاڑ دو دینا۔ نہا دھو کر مورتی کے لئے گنگا جل رکھنا، مورتی کو سیندور لگانا، پرشاد بانٹنا۔ دکشنا سمیٹنا۔ جوان عورتوں کی طرف تاکنا۔ الغرض ایک ہوشیار پجاری کے جتنے بھی کام تھے۔ وہ اُنہیں نہایت دلجمعی سے سرانجام دیا کرتا تھا۔ اُس کا بوڑھا باپ اپنے ضمیر کو گناہوں کے بار سے بچانے کے لئے اکثر اُس سے کہا کرتا تھا " بیٹا۔ ہم مندر کے پجاری ہیں۔ اس کی عزت اور تقدیس کے محافظ۔ ہماری نگاہوں میں بھی سچائی۔ عزت اور تقدیس ہونی چاہیئے تم ابھی جوان ہو۔ جب عورتیں مندر میں آیا کریں تو ہمیشہ نظر نیچی رکھا کرو۔" لیکن باپ کے کہنے کے باوجود بھی نہ جانے اُس کے دل کو کیا ہوا تھا۔ وہ عورتوں پر للچائی ہوئی نظریں ڈالنے سے باز نہ رہ سکتا تھا۔ اُن عورتوں میں اُسے ایک لڑکی تو خاص طور پر پسند تھی۔ اُس کے کپڑے سادہ اور صاف ہوتے تھے۔ آنکھوں میں ایک کیف آور تازگی آنکھیں تھیں وہ، یا کنول کے دو پھول تالاب کی نیلی سطح پر کھلے ہوئے۔ اُسے اس مندر میں آتے جاتے تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا۔ لیکن اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اُسے مدتوں سے جانتا ہے۔ ہمیشہ سے جانتا ہے۔ شاید پُرانے جنموں سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ رہے ہیں۔ کبھی کبھی سوچتا کہ ایسا خیال کرنا بھی گناہ ہے، اُسے اپنے باپ کے الفاظ یاد

آجاتے۔ اور وہ سوچتا۔ میں مندر کا پجاری ہوں مجھے ان گناہوں سے بچنا چاہیئے۔ دل کو بُرے خیالات سے پاک رکھنا چاہیئے۔ اگر میرے باپ کو پتہ لگ گیا تو وہ مجھے مندر سے ہی نہیں بلکہ گھر سے بھی نکال دے گا۔ لیکن کیا کرے اُس کا من اور اُس کی آنکھیں اُس کے قابو میں نہ تھیں۔ اُسے اپنے گناہ کا ہلکا ہلکا احساس ضرور تھا۔ لیکن وہ جتنا اس گناہ کے احساس سے دُور بھاگتا وہ اتنا ہی اُس کے نزدیک ہوتا گیا۔ اگر جب وہ مندر میں نہ آتی تو وہ بے چین ہو جاتا۔ اور اُس کا دل ایک نامعلوم بوجھ سے بیٹھ جاتا۔ اور پھر جنم اشٹمی کے دن اُس سے کتنی بھول ہوئی۔ وہ کئی دن گذر گئے مندر میں نہ آئی تھی۔ اور وہ انتظار کرتے کرتے پاگل سا ہو گیا تھا۔ اور ہر وقت یہی خواہش کرنے لگا تھا کہ وہ آئے تو اُسے اپنی باہوں میں بھینچ کر اُسکے لب چوم لے۔ وہ لب جو لال احمر کی طرح چمکتے تھے۔ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن ناکام رہتا۔

جنم اشٹمی کی رات کو اُس نے مندر میں کرشن جی کے لئے جھولا ڈالا۔ آج اس نے بڑی محنت سے جھولے کو سجایا تھا۔ طرح طرح کے ریشمی دوپٹوں سے ہر قسم کے پھولوں سے، ریشمی سرسراتے ہوئے کپڑوں سے، آج کرشن جی کا جنم دن تھا۔ آج بھی اُسے کسی کا انتظار تھا۔ وہ کسی کی آمد میں گھڑیاں گننے لگا۔ وہ آج ضرور آئے گی۔ اس کا دل ایک نامعلوم خوشی سے اُچھلنے لگا۔ آج رات کے بارہ بجے کرشن مہاراج

جنم لیں گے۔ وہ آج ضرور آئے گی۔ دس بج گئے لیکن وہ ابھی تک نہ آئی تھی۔ مندر درشن کی پیاس رکھنے والوں سے بھرا پڑا تھا۔ لوگ اُس کا جھولا دیکھ کر دوسرے مندروں میں جھولے دیکھنے کے لئے جا رہے تھے۔ پونے بارہ ہو گئے۔ لوگ بڑے بڑے مندروں میں سنہری جھولے دیکھنے کے لئے چلے گئے تھے۔ مندر ویران اور سنسان تھا۔ وہ آج بھی نہ آئی تھی۔ اُس کا دل مایوسی سے بیٹھنے لگا۔ وہ آج نہیں آئے گی۔ کتنا پاگل تھا وہ، اس پاک اور پوتر جگہ پر وہ اس قسم کی باتیں کر رہا تھا۔ اُسے شرم آنی چاہیئے۔ بارہ بج گئے۔ اور کرشن جی کے جنم کی خوشی میں سنکھ پھونکنے لگا اور گھڑیال بجانے لگا۔ آرتی کرتے ہوئے اُس نے محسوس کیا کہ کوئی اُس کے پیچھے کھڑا آرتی میں اُس کا شریک تھا۔ وہ آنکھیں بند کئے ہوئے آرتی کر رہا تھا۔ لیکن مڑ کر اور آنکھیں کھول کر وہ اپنے پیچھے کھڑے ہوئے ساتھی کو دیکھنا چاہتا تھا۔ کون ہے وہ۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اور آرتی ختم ہونے کے بعد اُس نے یکبارگی مُڑ کر دیکھا۔ ہاں وہی تھی۔ انجان الّھڑ اور خوش، بالکل سونے کی مُورت۔ اُس کے دل کی دھڑکن اور بھی تیز ہو گئی۔ اب آرتی ختم ہو چکی تھی اور وہ مندر کے گرد پھیر کر جا رہی تھی۔ مندر سُنسان تھا۔ مورتی خاموش تھی۔ رات کے بارہ بجے۔ وہ دبے پاؤں سے اُسکے پیچھے چلا اور پھر یکایک اُس نے اُسے اپنی باہوں میں دبوچ لیا۔

لڑکی نے اپنے آپ کو چھڑانا چاہا۔ لیکن اُس کی گرفت اور بھی مضبوط

ہو تی گئی۔ لڑکی نے زور سے ایک چیخ ماری۔ اور پھر ایک زور کا چپا نٹا اُس کے گال پر پڑا۔ وہ الگ کھڑا ہو گیا۔ اُس کا بوڑھا باپ اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ اُسے احساس ہوا جیسے آسمان سر سے اُٹھ گیا ہو۔ جیسے زمین پیروں تلے سے سرک گئی۔ اُسکے باپ نے قہر آلود نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا اور کہا "تم مندر کے پجاری بننے کے لائق نہیں ہو۔ تمہاری لاج گناہوں سے آلودہ ہو گئی ہے فوراً اِس مندر سے باہر نکل جاؤ!"

"بابا مجھے معاف کر دو"

"پیشتر اس کے کہ شہر کے لوگ تمہیں بے عزت کر کے اس مندر سے باہر نکال دیں۔ تمہیں چاہیئے کہ تم خود ہی اسجگہ سے چلے جاؤ۔ اس شہر سے چلے جاؤ۔ اپنے گناہ کا پرائشچت کرو۔ پرمیشور کی پوجا کرو۔ اور اپنے من کو ان ناپاک خیالات سے بچاؤ!"

باپ نے یہ الفاظ کانپتی ہوئی آواز میں کہے تھے۔

تو وہ بھاگ نکلا تھا گھر سے، پہلو میں ایک شکست خوردہ دل لیئے ہوئے، اِدھر اُدھر مدّت تک گھومتا رہا تھا۔ اور اب اس علاقے میں آ نکلا تھا۔ اُس کا روزگار گیا تھا۔ وہ ایک ہی فن جانتا تھا۔ اور اب اُس نے ٹھان لی کہ وہ ایک سادھو بن جائے اُس کے باپ دادا اس فن کے ماہر تھے۔ تو پھر وہ کیوں اس فن سے جس سے اُسے خاص واقفیت

بھی فائدہ نہ اُٹھاتا۔ فقیری میں اُسے روٹی ضرور مل جائے گی۔ اور شاید اب وہ اس لڑکی کو بھی بھول جائے گا۔ اُس نے ایک لمبا چغہ پہن لیا اور علاقے بھر میں گھومنے لگا۔ اُس نے دل میں ٹھان لیا تھا کہ اب وہ اپنی زندگی سدھارے گا۔ اور ایک سچے سادھو کی سی زندگی بسر کرے گا۔ وہ ریاضت کی زندگی بسر کرنے لگا۔ اس فقیرانہ زندگی بسر کرنے میں اُسے کتنی تکلیفات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ بہت کم بار زمین پر سویا تھا اب ہر بار اُسے زمین پر سونا پڑتا تھا۔ وہ پو پھٹنے سے پہلے اٹھتا اور باہر جنگلوں میں گھومنے کے لئے چلا جاتا اور اکثر کبھی کبھار لوگوں کو دکھاوے کے لئے گیتا اور رامائن کا پاٹھ بھی کر لیتا تھا۔ اس علاقے کے لوگ کتنے سیدھے سادے تھے۔ اُس کی ہر بات مان لیا کرتے تھے۔ اب تو اُس کے بال بھی لمبے ہو گئے تھے۔ اور اب وہ بالکل جٹا دھاری سادھو معلوم ہوتا تھا۔ ایک برگزیدہ سادھو۔ لوگوں نے اُس کے رہنے کے لئے اُسے ایک جھونپڑی سی بنا دی تھی۔ اور اُس نے اس جھونپڑی کے ارد گرد پھولوں کا چھوٹا سا باغیچہ بھی لگا لیا تھا۔ اب وہ ایک لمبا تلک لگایا کرتا۔ اور صبح و شام دھونی رمایا کرتا۔ آس پاس کے گاؤں کے لوگ صبح ہوتے ہی اُسے پرنام کرنے کے لئے آ جاتے تھے۔ کوئی اُسے آٹا دے جاتا۔ کوئی پھل۔ کوئی خوبصورت پھول۔ کوئی پیسے جو پھولوں سے بھی زیادہ خوبصورت ہوتے ہیں۔ بھلا وہ کوئی ایسا ویسا سادھو تو نہیں تھا کہ لوگوں کے دلوں پر قابو نہ پا سکتا۔ رفتہ رفتہ اُس کی دھوم

آس پاس کے علاقوں اور گاؤں میں مچ گئی "یہاں ایک گیانی مہاتما آئے ہوئے ہیں ۔ بڑے بھگت ہیں" مائیں اپنے بچوں کو لے کر اُس کے پاس آتی تھیں، اور اپنے بیمار لڑکوں کے لئے اُس سے شفا چاہتی تھیں وہ دھونی سے خاک کی ایک چٹکی انہیں دے دیا کرتا تھا۔ اور وہ اچھے ہو جاتے اور لوگ کہتے "بابا۔ آپ کی چٹکی تو امرت ہے"۔ وہ لوگوں کو بڑے کام کی باتیں بتایا کرتا۔ اکثر لوگ اُس سے پوچھتے "بابا پرماتما کہاں ہیں"؟ تو وہ کہہ دیا کرتا، "اُوپر۔ آسمان میں۔ ہر جگہ۔ آدمی کے دل میں"۔ کئی لوگ پوچھتے "بابا آپ نے پرماتما کو دیکھا ہے"؟ وہ ان باتوں کا کیا جواب دے سکتا تھا۔ ابھی تک نہ تو اُس نے خدا کو دیکھا تھا اور نہ پایا تھا لیکن وہ کہہ دیا کرتا جب میں رات کو سمادھی لگاتا ہوں تو پرماتما مجھے ساکشات درشن دیتے ہیں۔ لوگ یہ سُنکر اس کی طرف حیرت سے تاکتے۔ اور پھر اُس کے پیر چھُو لیتے اور اُس کے پاؤں کی خاک ماتھے سے لگا لیتے۔

اب اُسے اس علاقے میں آئے ہوئے چار پانچ سال ہو چکے تھے وہ اس حسین لڑکی کو کسی حد تک بھول چکا تھا۔ دل کا زخم بھر چکا تھا۔ گو نشان ابھی قائم تھے۔ اُس نے سوچا وہ کچھ عرصہ اور یہاں پڑا رہے اور گہری ریاضت سے ان نشانوں کو بھی معدوم کرنے کی کوشش کرے۔ یہ علاقہ بہت خوبصورت تھا۔ ایک دلکش وادی۔ چاروں طرف اُونچے اونچے پہاڑ۔ پہاڑوں پر چیل اور دیودار کے درخت

اُگے ہوئے تھے۔ اُس کی کٹیا کے سامنے ایک پہاڑی نالہ بہتا تھا اُس کا پانی ٹھنڈا اور شفاف تھا۔ اکثر وہ نالے سے گزر کر پہاڑوں پر پھیلے ہوئے جنگل میں غائب ہو جاتا تھا۔ وہ جنگل کتنا گھنا معلوم ہوتا تھا۔ بیلے بھکیڑ اور تیر بو کی جھاڑیاں۔ پھر سنبلو اور پیلو کی پھلدار جھاڑیاں اُنکے بعد جوں جوں وہ پہاڑ پر چڑھتا جاتا اُسے کھٹّے اناروں کا پھیلا ہوا جنگل دکھائی دیتا۔ ان کے بعد چیل اور پھر دیودار کے درختوں کی قطاریں شروع ہو جاتیں، ہوا میں کتنی تازگی اور لطافت ہوتی تھی۔ کئی جگہوں پر تو جنگل اس قدر گھنا ہو جاتا کہ درخت اپنے سبز پتّوں سے سورج کی کرنیں روک لیتے تھے۔ جنگل سے واپس آتے ہوئے شام کے وقت کئی بار اُسے لومڑیاں اور گیدڑ جھاڑیوں میں چھپتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ اِس جنگل میں نجانے کیوں اُسے اُس لڑکی کی یاد آجاتی تھی۔ جسے وہ ہردم بھلانے میں مصروف تھا۔ جنگل سے لوٹ کر وہ سمادھی لگاتا۔ کئی بار کرشن جی کی تصویر سامنے رکھ کر وہ مالا پھیرا کرتا لیکن اُس کے خیالی ہیولے میں کسی اور ہی کی تصویر آجاتی، اُس کا جسم آگ کی طرح گرم ہو جاتا، اُس کے کان لال ہو جاتے، اُس کے خون کی روانی تیز ہو جاتی، اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا، اور اُس کا حلق خشک ہو جاتا، اور وہ اکثر ایسے موقعوں پر نالے پر نہانے کے لئے چلا جاتا، جس کے ٹھنڈے برفیلے پانی میں اُسے ایک عجیب راحت اور سکون ملتا تھا۔

کچھ سال اور گذر گئے، اُس کے سر کے بال اور لمبے ہو گئے اُس کی فقیری کا رنگ اور چمک گیا، وہ اب ایک مکمل سادھو سمجھا جاتا تھا۔ لوگ اب اُسے "بابا" کہہ کر بلاتے ہیں۔ اور پھر اب اس میں اور رشی مُنیوں میں فرق ہی کیا تھا۔ کیا اُس نے دس سال تک گھور تپسیا نہ کی تھی، کیا اُس نے دس سال تک مالا کے منکے نہ پھیرے تھے، کیا اُس نے اسی جگہ بیٹھے ہوئے دس سال دھونی نہ رمائی تھی، کیا اُس نے ان دس سالوں میں لوگوں کے دلوں کو موہ نہ لیا تھا۔ کیا گذشتہ دس سال سے اُس کے پاس علاقہ بھر کے لوگ۔ عورتیں، بچے اُس کے پاس نہ آتے جاتے تھے۔ اس دس سال کے عرصہ میں اُس نے وہ سب کچھ کیا جو ایک سادھو بننے کے لئے اُسے کرنا چاہیئے تھا۔ ان دس سالوں کے عرصہ میں اُس نے جنگلوں کی خاک چھانی تھی، خدا کی عبادت کی تھی، اُس نے اپنی جوانی کو پیروں تلے روندا تھا، اپنی خواہشات کو دبایا تھا اپنی تمنّاؤں کے گھروندے کو برباد کیا تھا۔ دن پاٹھ کرتے کرتے اور راتیں جاگ جاگ کر گذاری تھیں۔ لیکن دل کو سکون حاصل نہ ہُوا تھا۔ رُوح میں وہی بے چینی تھی، دماغ میں وہی خلل، وہی لرزش، اور پھر بہار کے دنوں میں جب درختوں کی شاخیں پھوٹ پڑتی تھیں اور ٹُنڈ مُنڈ درخت ہرے بھرے ہو جایا کرتے اور سفید و سُرخ پھول سیب کی ٹہنیوں پر مُسکرانے لگتے تھے، اور جب گاؤں کی نوخیز لڑکیاں اپنے بالوں میں شوخ پھول ٹانک کر اُس کے چرن چھُونے

کے لئے آیا کرتی تھیں تو کئی بار اُس نے اپنے ہونٹوں کو کاٹ کھایا تھا۔ کئی بار وہ راتوں کو اُٹھ کر غسل کیا کرتا تھا۔ جب کھیتوں میں سرسوں پھولتی اور اُسے چاروں طرف پھول ہی پھول نظر آتے، جب پہاڑوں پر سبزہ ہی سبزہ ہوتا۔ اُسے اُس وقت اُس حسین وادی میں چاند اور ستاروں کے سوا اور کچھ نہ نظر آتا تھا۔ وہ اکثر سرسوں کے کھیتوں میں پاگل ہوکر لوٹنے لگتا تھا۔ اور سرسوں کے پھولوں کو کھانے لگتا تھا۔ بہار کے دنوں میں جب لوگ اُسے سرسوں کے کھیت میں لیٹا ہُوا دیکھتے تو وہ سمجھتے۔ اُسے پرماتما سے کتنی لگن ہے۔ وہ پرمیشور کی یاد میں مست ہوگیا ہے۔ لیکن اُنہیں کیا معلوم کہ اُسے بہار نے پاگل بنا دیا تھا۔ وہ اکثر سوچتا کہ خدا نے یہ خوبصورتی کیوں بنائی، یہ پیلے پیلے پھول یہ پھلوں سے لدے ہوئے درخت، یہ چاند کی ٹھنڈی روشنی، یہ ہنستے ہوئے ستارے کس کے لئے تھے؟ اور اگر یہ سب کچھ خدا کے لئے تھا۔ تو انسان کے لئے کیا تھا۔

وقت گذرتا گیا، اب وہ لوگوں سے بہت کم ملتا، بہت کم بولتا، اب وہ زیادہ وقت خدا کی یاد میں گذارتا، لوگ کہتے تھے باواجی اب مگنا ہوگئے ہیں۔ اپنے پرمیشور کے ہر روز درشن ہوتے ہیں، وہ رات کو پرماتما سے باتیں کرتے ہیں۔ اور ہر شخص کے دل کی بات جان جاتے ہیں اور ہر آفت کو ٹال سکتے ہیں۔ اب اُسے یہاں آئے ہوئے چودہ پندرہ سال ہوگئے تھے۔ اُس کے درشن کرنے کے لئے لوگ دُور دُور

سے آتے تھے۔ لوگ کہتے تھے۔ باوا جی کے چہرے پر نور ہے۔ جلال ہے۔
اُن کی پیشانی چمکتی ہے۔

رات کو چاند کی سپید روشنی میں جب وہ اپنی زندگی کے اوراق پلٹتا تو اکثر سوچتا کہ اُس نے ان پندرہ سالوں میں کیا کچھ کیا ہے، کیا کچھ حاصل کیا ہے، اور جب وہ جائزہ لیتا تو اُسے معلوم ہوتا کہ اس عرصہ میں اُس نے اپنے آپ کو مارا۔ اپنی عقل کو مارا۔ اپنے جسم کو بھوکا رکھا۔ لیکن ان پندرہ سالوں میں سوائے ایک لڑکی کو بھول جانے کی کوشش کے ——— وہ اور کچھ نہ کر سکا تھا۔ ریاضت اور عبادت نے اُسے ابھی دل کا سکون عطا نہ کیا تھا۔ پیٹ کی بھوک بھی بدستور تنگ کرتی تھی۔ دماغ کی پریشانی اُسیطرح تھی۔ لوگ اُس کی عزت کرتے تھے۔ لیکن اس عزت کو حاصل کرنے کے لئے اُس نے اپنی خوشی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے۔ اُس نے سوچا اس وسیع آسمان تلے صرف اُسی کا دل کیوں کسی نہ معلوم شئے کے لئے بے تاب رہتا ہے۔ اور پھر لوگ اُسے دیوتا سمجھتے ہیں۔ اَن پڑھ جاہل۔

اور پھر بہار آئی۔ بہار سے اُسے اکثر ڈر لگتا تھا۔ بہار اُس کے دبے ہوئے جذبات کو بیدار کر دیتی تھی۔ اس کی سوئی ہوئی اُمنگوں کو جگا دیتی تھی۔ ان اُمنگوں کو مارنے کے لئے اُس نے کیا کچھ نہیں

گیا۔ لیکن یہ اُمنگیں کیوں نہیں مرتیں، کیا یہ اُمنگیں بھی اُس کی زندگی کا حصّہ تھیں، اب جو بہار آئی۔ تو اپنے ساتھ رجنی لائی۔

رجنی اپنی ساس کے ہمراہ آیا کرتی تھی۔ اور اکثر کئی گھنٹے ساس اور بہو دونوں اُس کے سامنے بیٹھا کرتیں۔ کئی بار رجنی کی ساس اپنی بہو کو وہیں چھوڑ کر کسی بہانے سے اِدھر اُدھر ہو جایا کرتی۔ اسیطرح کئی بار ہُوا۔ اور کیوں ہُوا، اور وہ خیال کرتا کہ کیا ہی اچھا ہو اگر ایسا نہ ہُوا کرے۔ بھلا یہ کیا چاہتی ہے۔ یہ کیوں ہر روز آتی ہے۔ اور ایک دن اُس نے بڑھیا سے پوچھ لیا۔ کیوں مائی جی آپ کو کیا تکلیف ہے، بڑھیا نے جواب دیا۔ بابا میری رجنی کے ہاں اولاد نہیں ہوتی۔ــــ ــــ اُس نے یہ جواب سُنکر راکھ کی ایک چٹکی دے کر ساس کو کہا۔ مائی، جاؤ اب پرمیشور نے چاہا تو اولاد ہو جائے گی۔ لیکن وہ پھر آجاتیں۔ وہ دونوں کئی کئی گھنٹے اُس کے پاس بیٹھا کرتیں۔

رجنی کو ہر روز آتے دیکھ کر اور اپنے سامنے بیٹھا دیکھ کر اُس کے دل کی حالت وہی ہونے لگی جس کا اُسے اندیشہ تھا۔ رجنی کی کنول کی سی آنکھیں۔ اُس کے رُخساروں کی شہتوت کی سی رنگت اور گول چہرہ، اُف، یہ سب کچھ کیوں تھا، برسوں کی ریاضت سے اُس نے جس دل کو راکھ سمجھا تھا۔ اس میں پھر سے دبی ہوئی چنگاری بھڑکنے لگی تھی۔ خصوصاً اُس دن جب رجنی نے چلتے چلتے اپنی انگیٹھی

شلوار اُونچی کر کے اُسے اپنی سپید پنڈلی دکھا دی تھی، تو وہ دیر تک اُس مرمریں سپیدی اور اُس خوب صورت جِلد کے متعلق غور کرتا رہا تھا۔

وہ رات بھر سو نہ سکا تھا۔ دوسرے دن اُس نے ارادہ کر لیا کہ وہ رجنی کو آنے سے منع کر دیگا، اُس نے رجنی سے پوچھا:۔

رجنی تم کیا چاہتی ہو۔

بابا۔ میرے ہاں اولاد نہیں ہوتی۔

لیکن تمہارا خاوند تو ہے نا۔

رجنی نے سر جھکا لیا اور پریشان نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

رجنی۔ تم یہاں نہ آیا کرو۔

یہ بات کہتے ہوئے اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، یہ بات کہکر وہ باغ میں چلا گیا۔ جہاں چاروں طرف سناٹا تھا۔ شگفتا لو کا درخت سفید سفید پھولوں سے مزیّن تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا درخت کی ہر ایک ٹہنی اپنے لئے آسمان سے تارے توڑ لائی ہے۔ سورج مکھی کے پھول شرمائی ہوئی دُلہن کی طرح ایک طرف کو جھکے ہوئے تھے۔ وہ کس سے اپنی تکلیف کا حال بیان کرتا، کس پر اس ناقابلِ برداشت درد کو ظاہر کرتا، جس سے اُس کی رُوح کا ہر ذرّہ تڑپ رہا تھا۔ اُس نے فیصلہ کیا۔ کہ اب اُسے یہاں نہیں رہنا ہوگا۔ ایک بار پھر در بدر گھومنا ہوگا۔

ورنہ ——— پھر وہ سوچنے لگا۔ کیا رجنی کل آئے گی۔ اُس نے تو رجنی کو آنے سے روک دیا تھا۔

دوسرے دن صبح کے وقت رجنی نہ آئی۔ اور اُسے ایک جھٹکا سا محسوس ہوا۔ ایسا جھٹکا جیسے کسی عزیز شے کے کھو جانے سے محسوس ہوتا ہے۔ وہ دیر تک رنجیدہ اور ملول رہا۔ وہ کیا کرے۔ آخر وہ سمادھی لگا کر بیٹھ گیا۔ لیکن سمادھی میں بھی وہ بے چین ہی رہا۔ پھر کسی کے قدموں کی چاپ نے اُسے چونکا دیا۔ رجنی پھر آگئی تھی۔ رجنی نے اُس کے چرن اپنے نازک ہاتھوں میں لے لئے۔ اور اپنی آنکھیں، آنسوؤں سے تر بتر آنکھیں اُس کے پاؤں سے لگا دیں۔

"رجنی، تم یہاں کیوں آئی ہو، یہاں سے چلی جاؤ۔ چلی جاؤ۔ بدبخت عورت!" اُس نے بڑی مشکل سے یہ الفاظ کہے۔ زبان سے "نہیں" کی صدا نکل رہی تھی۔ لیکن جسم کا ہر ذرّہ "ہاں" کہنے پر مصر تھا، اُس کا دماغ چکّرانے لگا۔ ہاتھوں سے مالا چھوٹ گئی۔ جسم ایک جلتی ہوئی بھٹی کی طرح گرم ہو گیا۔ ریاضت کے بندھ ٹوٹ گئے۔ اور جوانی کا راگ اُس کے کانوں میں گونجنے لگا۔

بیٹھے بیٹھے اُسے رجنی نے جگا دیا "بابا، ہم کہاں آگئے ہیں؟" پھر اُسی جگہ جہاں سے بھاگ کر گیا تھا!" اُسکے مُنہ سے بے اختیار نکلا۔

یہی پلیٹ فارم تھا۔ یہی ریل کی پٹڑی، مسافر اِسیطرح اِدھر

اُدھر بھاگ رہے تھے۔ قلی اسی طرح "قلی! صاحب قلی چاہیئے قلی!" پکار رہے تھے۔ اور پھر وہ رجنی کی آنکھوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس نے محسوس کیا کہ جتنا سکون اُسے ان آنکھوں کو دیکھنے سے ملتا ہے۔ اُسے سولہ برس کی ملازمت سے بھی نہیں ملا۔
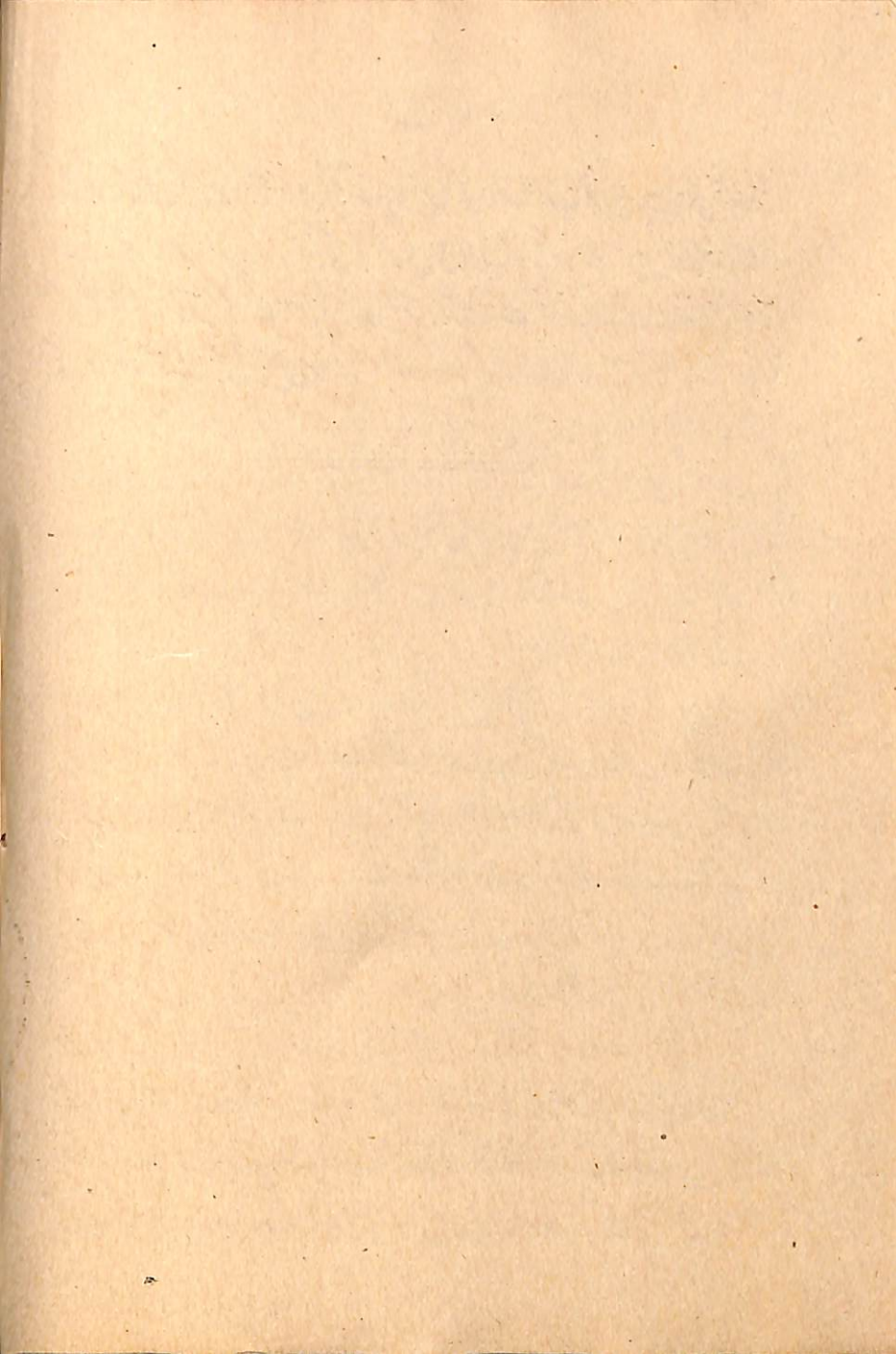
چھ بجکر بیس منٹ پر

رضیہ کبھی کبھی سوچتی۔ کہ اس سے کیوں کوئی محبت نہیں کرتا۔ آخر
اس میں کونسی کمی ہے اور پھر اس کی سہیلیاں کہاں کی خوبصورت ہیں۔ جو
وہ ہر روز اسے اپنی محبت کے قصے سناتی رہتی ہیں۔ کیا ان کے قصے سچے ہوتے
ہیں یا من گھڑت۔ یا یہ کہ وہ اپنی سنہری آرزوؤں کو خوابوں کی دنیا میں
دیکھکر خوش ہو جاتی ہیں۔ اکثر جب وہ اپنا چہرہ آئینے میں دیکھتی۔ تو اسے
کوئی خاص لطف نہ آتا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ خوبصورت نہ تھی۔ اس
میں اتنی کشش یا جاذبیت نہ تھی کہ لوگ اسے دیکھ کر ٹھٹک جاتے۔ یا خود
بخود اس کی طرف کھنچے چلے آتے۔ چھوٹا سا قد تھا۔ گندمی رنگ۔ آنکھیں
چھوٹی چھوٹی۔ ہونٹ کچھ کچھ موٹے۔ چہرہ گول سا۔ اس کی پیشانی تنگ

تھی۔ ہاں کمر کے بال لمبے تھے۔ اس کے جسم میں کوئی خاص رعنائی نہ تھی۔ اور
پھر اس کی عمر بھی کیا تھی یہی کوئی پندرہ سال۔ لیکن ان باتوں کے باوجود وہ
بدصورت نہ تھی۔ بلکہ اسے ہر وقت یہی خیال لگا رہتا تھا۔ اور یہ خیال یقین
کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ کہ وہ بدصورت نہیں ہے اور پھر اس کی سہیلیاں
اس سے بھی بدصورت تھیں۔ بنّو ہی کو دیکھ لو۔ نہایت پتلی۔ عمر کوئی سترہ برس
کی ہوگی۔ لیکن نہ سینے کا ابھار۔ نہ چال میں ہی لچک۔ نہ چہرے پر رونق۔
لمبی موٹی سی ناک۔ ہاں اس کا قد لمبا تھا اور ہر سال لمبا ہوتا جاتا تھا۔ بنو
کو اپنے قد پر ناز تھا۔ اور کبھی کبھی وہ کہتی "دیکھا اسے کہتے ہیں سرو قد" لیکن
بنو کی آنکھیں دیکھ کر وہ دم بخود ہو جاتی۔ اس کی آنکھوں میں ایک بے پناہ
بجلی کوندتی نظر آتی۔ جیسے وہ آنکھیں مردوں سے کہہ رہی ہیں "مجھے لیلو"۔
اکثر وہ سہیلیوں کے ساتھ آنکھیں مٹکا مٹکا کر باتیں کرتی۔ جیسے اسے
اس طرح باتیں کرتے ہوئے خاص سرور حاصل ہو رہا ہے۔ بنو عجیب قسم
کی لڑکی تھی۔ وہ اکثر لڑکوں کے متعلق باتیں سنایا کرتی تھی۔ اور اس کی
ہمجولیاں نہایت انہماک سے اس کی گفتگو سنا کرتیں۔ سچ تو یہ ہے کہ
بنو کو لڑکوں کے متعلق باتیں کرتے بڑا ہی مزا آتا تھا۔ اکثر باتیں کرتے
کرتے اس کے گال تمتما اٹھتے۔ اس کے گالوں پر ہلکی سی لالی اور اسکی چھوٹی
چھوٹی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک آجاتی۔ اور کبھی کبھی تو اس کا سانس
تیز ہو جاتا اور پھر وہ اپنے گھٹنوں پر سر رکھ کر لڑکیوں کی طرف دیکھنے لگتی۔
بنو کی باتوں میں ایک قسم کی جنسی بھوک نمایاں تھی۔ ایک قسم کی بیماری سی

پیاس اور ہلکی سی تشنگی جو وہ خود بھی محسوس کرتی تھی۔ لیکن اتنی شدت سے نہیں۔ گو رضیہ کو بنو کی باتیں سنکر بڑا حظ حاصل ہوتا۔ لیکن وہ اکثر رات بھر نہ سو سکتی تھی۔ رات کی تاریکی میں بنو کے کارنامے اور ان قصّوں کے ہیرو اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتے۔ اور اس کے دل و دماغ پر ایک لذت بھری بے چینی چھا جاتی۔ بنو شہر کے خوبصورت لڑکوں کے متعلق باتیں کیا کرتی کہ فلاں لڑکا اسے فلاں موڑ پر ملا تھا۔ اور دور تک اسے نہایت غور سے دیکھتا تھا اور پھر اس کا پیچھا کرتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ اپنی سہیلی کے گھر چلی گئی۔ لیکن جب وہ باہر نکلی تو لڑکا اس گھر کے قریب گھوم رہا تھا۔ اس کا دل کس طرح دھک دھک کرنے لگ گیا تھا اور پھر وہ کس طرح اسے گھر تک پہنچا آیا تھا اور اس طرح وہ طرح طرح کے قصہ سناتی۔ اکثر اس کی ہمجولیاں بنو کو کہہ دیتیں "بنو تو بہت بے شرم ہے۔ تجھے ایسی بات کرتے ہوئے ذرا لاج نہیں آتی"

"اس میں بے شرمی کی کیا بات ہے۔ میں جو محسوس کرتی ہوں کہہ دیتی ہوں اور میں جانتی ہوں کہ تم بھی لڑکوں کو دیکھ کر اسیطرح محسوس کرتی ہو۔ لیکن تم کہتی نہیں"

"چل پرے ہٹ۔ سب کو اپنے جیسا سمجھتی ہے۔ ہمارے دلوں میں ایسے بُرے خیال نہیں آتے" اور پھر سب کھکھلا کر ہنس پڑتیں۔ مبادا بنو ناراض نہ ہو جائے اور وہ اس کی روح پرور باتوں سے محروم ہو جائیں۔ بنو کی باتوں نے رضیہ کے دل میں طرح طرح کی امنگیں پیدا کر دیں جو شاید کچھ

سال بعد پیدا ہوئیں ۔ رضیہ اور بنو کی اب گاڑھی چھننے لگی تھی اور بنو رضیہ کے
گھر ہر روز آیا کرتی ۔ اب اس نے بہت سے لڑکوں کے متعلق باتیں کرنی
چھوڑ دی تھیں ، اب وہ صرف ایک ہی لڑکے کے متعلق باتیں کیا کرتی ۔ ایک
ہی لڑکے کے قصے سنایا کرتی ، اور جب کبھی اس کا کوئی خط آجاتا ۔ تو وہ
دوڑے دوڑے رضیہ کے پاس جاتی ۔ اور وہ دونوں اس خط کو پڑھا کرتیں
خط پڑھتے پڑھتے دونوں کا دل دھک دھک کرنے لگتا ۔ بنو کا اس لئے کہ وہ
اپنے محبوب کا خط پڑھ رہی ہوتی اور رضیہ کا اس لئے کہ اس کے لئے ایک
نیا تجربہ تھا ۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ جب بنو اپنا قصہ ختم کر لیتی ۔ تو سعیدہ آ
جاتی ۔ سعیدہ اور بنو میں کافی فرق تھا ۔ اگر بنو بدصورت تھی تو سعیدہ نہایت
حسین ۔ لڑکیوں کو اس پر بڑا رشک آتا تھا ۔ سعیدہ کی باتیں سن کر وہ حیران
ہو جایا کرتی تھیں ۔ اس کی باتیں نہایت بیباک اور ساتھ ہی ان میں انجان
پن کی جھلک تھی ۔ اسے بھلا یہ کیا کہنے کی ضرورت تھی کہ اس کی نسبت رضیہ کے
بھائی سے ہونے والی ہے ۔ گو سگائی کی بات چیت ابھی تک ابتدا ہی پر تھی
اور کیا معلوم کہ سگائی ہو یا نہ ہو ۔ لیکن سعیدہ کچھ اس ڈھنگ سے باتیں
کرتی ۔ جیسے وہ رضیہ کے بھائی کو رفیق حیات بنا چکی ہے اور اکثر اس کے
گھر سہمے سہمے آتی اور اِدھر اُدھر دیکھتی جیسے کسی نادر چیز کو ڈھونڈھ رہی ہے
اور جب کبھی اسے معلوم ہو جاتا کہ بھائی صاحب گھر میں موجود ہیں تو سہم جاتی
اب وہ اس پرندے کی طرح دکھائی دیتی جسے اپنے شکاری کی قربت کا احساس
ہو جائے اور اگر کبھی بھائی اچانک اس کے سامنے آجاتے تو وہ شرم سے

آنکھیں نیچی کر لیتی اور پھر ہنسکر رضیہ کو چھیڑتی ۔ سگائی کا معاملہ کچھ کھٹائی میں پڑ گیا ۔ لیکن سعیدہ کا اشتیاق کم نہ ہوا ۔ اور جب کبھی سعیدہ اسے اسکول میں ملتی ۔ تو اس سے پوچھتی ۔ کہ بھائی صاحب کہاں ہیں ۔ انہوں نے کونسے رنگ کا سوٹ پہن رکھا ہے اور ایک دن تو سعیدہ نے رضیہ سے صاف کہہ دیا کہ میں تو ان کی ہو چکی ۔ آگے ان کی مرضی ۔ سعیدہ نے کئی لڑکیوں کو اپنی محبت کا قصہ سنا دیا اور لڑکیوں کو یقین دلا دیا ۔ کہ اس کا بھی ایک محبوب ہے ۔ رضیہ کی سب سہیلیاں یعنی بنو سعیدہ ۔ پر کاش شانتی سب کی سب "اپنے محبوب" کے متعلق باتیں کرتیں اور بیچاری رضیہ دانت پیس کر رہ جاتی کہ آخر کیا بات ہے کہ اس سے کوئی محبت نہیں کرتا ۔ آخر اس میں کونسی خامی ہے ۔ جس کی بدولت وہ لڑکوں کی نظر میں نہیں چڑھتی ۔ اس کی زندگی میں ایک چھوٹا سا خلا پیدا ہو گیا ۔ ایک نامعلوم سی بے چینی اور اداسی ۔ اس کے گھر کا ماحول بہت گھٹا گھٹا سا تھا ۔ گھر میں ان کی سوتیلی ماں کا بہت رعب تھا ۔

رضیہ کو یاد بھی نہ تھا کہ اسکی ماں کب فوت ہوئی تھی ۔ وہ ماں کی نازبرداریوں سے آجتک محروم رہی تھی ۔ اکثر لڑکیاں اپنی ماؤں کے متعلق تعریفی کلمات کہا کرتی تھیں ۔ لیکن رضیہ بیچاری زندگی میں ماں کے خلوص اور پیار سے بیگانہ تھی ۔ بچپن میں اسے ایک دایہ نے پالا ۔ اور جب اس نے ہوش سنبھالا تو اس کے باپ نے دوسرا بیاہ کر لیا تھا ۔ گو اس کی سوتیلی ماں نے اسکے ساتھ کوئی برا سلوک نہیں کیا تھا ۔ لیکن پھر بھی رضیہ کو اپنی سوتیلی ماں کی یاد ستاتی

تھی۔ اس کے بچپن کی دایہ اب بوڑھی ہو چکی تھی۔ لیکن سوتیلی ماں نے اُسے
رضیہ کا نگہبان بنا دیا تھا۔ بلکہ ایک طرح کی جاسوس۔ اکثر رضیہ کی سوتیلی ماں
رضیہ کی باتوں میں کوئی نہ کوئی نقص نکالا کرتی اور کہتی بیٹی اب تو جوان ہو
چکی ہے۔ تجھے سنبھل کر قدم رکھنا چاہیئے۔ اگر وہ اس پر اکتفا کرتی تو خیر
کوئی بات نہ تھی۔ لیکن اس کی ماں اسے ہر بات پر ٹوکتی اور کہتی ٹیڑھی مانگ
نہ نکالا کرو۔ سُرخ دوپٹہ نہ پہنا کرو۔ سر ننگا نہ کیا کرو۔ زور زور سے
ہنسا نہ کرو۔ آنکھیں نہ مٹکایا کرو۔ شعر نہ پڑھا کرو اور جب بھائی
صاحب بیٹھک میں آجائیں تو تمہیں فوراً اپنے کمرے میں آجانا چاہیئے۔
کبھی کبھی جب وہ اپنے بھائی کے بستر پر بیٹھ جاتی تو اس کی ماں اسے فوراً
جھڑک دیتی۔ بھائی کے بستر پہ نہ بیٹھا کرو۔ وہ عجیب وہم میں پڑجاتی
تھی۔ کہ اس بستر میں کیا ہے۔ وہی رضائی۔ وہی کمبل۔ وہی چادریں۔ آخر
ان تمام باتوں کا مطلب کیا ہے اور بہت غور و فکر کرنے کے بعد وہ چپ
ہو جاتی۔ اور اگر ماں اسے ہر بات پر ٹوکتی تو اس کا باپ اسے کچھ نہ کہتا
تھا اور جب کبھی رضیہ ماں کی جھڑکیوں سے تنگ آکر باپ کے سامنے اپنا
رونا روتی۔ تو باپ اس سے نہایت پیار کے لہجے میں کہتا۔ رضیہ بیٹی اپنی
ماں کا کہا ماننا چاہیئے۔ وہ تمہارے بھلے کے لئے ہی تو کہتی ہیں اور رضیہ
بیچاری یہ جواب سنکر جل بھن جاتی۔ سے رہ رہ کر اپنے بھائی پر غصہ آتا
تھا۔ جو ہمیشہ عورتوں کی آزادی کے متعلق ڈینگیں مارتا تھا اور کہا کرتا تھا
کہ عورتوں کو بھی مردوں کی طرح آزادی ملنی چاہیئے۔ عورت اور مرد زندگی

کے دو پہیے ہیں۔ اگر ایک پہیے کو زنجیر سے باندھ دیا گیا تو زندگی کی گاڑی کا چلنا دشوار ہو جائے گا اور یہاں مساوات تو کیا زندگی کے معمولی لوازمات سے لڑکیوں کو محروم کیا جاتا ہے اور بھائی صاحب ہیں کہ چوں تک نہیں کرتے اور پھر یہ جاسوس دایہ! یہ کب تک اس کا پیچھا کرے گی؟ رضیہ جس سہیلی کے گھر جاتی۔ یہ بھی لڑھکتی، مرتی، گرتی پڑتی، ساتھ چلی جاتی ہے۔ اس نے کبھی بھی انکار نہیں کیا۔ کبھی بھی یہ نہیں کہا کہ میں بوڑھی ہو گئی ہوں۔ اب ٹانگوں میں سکت نہیں ہے۔ اب کی بار میں نہیں جا سکتی۔ انکار تو درکنار۔ یہ تو اوپر سے بھی نمک مرچ لگاتی ہے اور گھر میں طرح طرح کے طوفان مچاتی ہے۔

"بی بی ——— بنو۔ تو مجھے پسند نہیں" کبھی سن لی ہونگی اس کی باتیں۔ بس پھر کیا تھا۔ جھٹ بڑی بی نے بی بی سے جا کر شکایت کہہ دی۔ جیسے ساری عمر اس نے مردوں کی طرف دیکھا ہی نہیں۔ چڑیل لگتی ہے چڑیل۔ اللہ اسے جلد قبر میں جگہ دے۔ اتنی بوڑھی ہے مگر جیئے جاتی ہے اور کبھی کبھی رضیہ سوچتی یہ بھائی۔ اخوت اور آزادی کے پرستار حریت اور ڈیموکریسی کے علمبردار، یہ جو عورتوں کے حقوق کے لئے بڑی بڑی تقریریں کرتے ہیں۔ یہ در اصل بڑے کمینے اور تنگ نظر ہیں۔ بھلا جب کبھی ان کے یار دوست آجاتے تو ڈرائنگ روم کا دروازہ ایک دم بند کہیں ان مردوں کا سایہ گھر کی صنف نازک پر نہ پڑ جائے۔ یا ہم کہیں ان سایوں کو نہ دیکھ لیں اور رضیہ کو معلوم تھا کہ بھائی اور انکے دوست اکثر جوان لڑکیوں کے متعلق گفتگو کرتے رہتے ہیں، اس دن کی بات ہے کہ ڈرائنگ روم میں اسکا

بھائی اور انکے دوست خوش گپیاں ہانک رہے تھے۔ تو ساتھ والے کمرے میں بیٹھکر ان کی تمام گفتگو سن رہی تھی۔ رضیہ کے بھائی بولے۔

"بھئی اصغر یہ بنو تو عجیب ہی لڑکی ہے۔ اتنی بلبلاک اور شوخ لڑکی میں نے کبھی نہیں دیکھی اور خدا کی قسم اسکی آنکھیں ——— کیا کہوں بنو کی آنکھوں میں تم سب کچھ پڑھ سکتے ہو۔ یعنی کہ یہ آنکھیں صاف صاف کہدیتی ہیں کہ تم سب چغد ہو۔ تم سب کاٹھ کے اُلّو ہو۔ تمہیں لڑکیوں سے بات کرنا نہیں آتا۔ یہ آنکھیں کیا ہیں دو آئینے جس میں تم موجودہ تہذیب کی جنسی بھوک کو صاف دیکھ سکتے ہو۔

اس دن کی بات ہے کہ میں اور رشید کمرے میں چائے پی رہے تھے ہمارے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ کچھ دیر کے بعد کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ہم نے سمجھا۔ شاید اصغر بھیّا آئے ہیں۔ جب دروازہ کھولا۔ تو اپنے سامنے بنو اور شانتی کو پایا وہ سیدھی ہمارے کمرے میں چلی آئیں۔ ہم تو بالکل پاگل ہو گئے کیا کریں۔ بنو کی بھوکی نگاہ ہمارے دل میں اتر گئی۔ میرا دل چاہا کہ بنو کو زور سے سینے سے چمٹا لوں۔ اتنے میں کسی کی آہٹ آئی۔ دیکھا تو اماں کھڑی تھیں۔ میں پانی پانی ہو گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں جاؤں۔ جھٹ بنو بول اٹھی۔ بھائی صاحب رضیہ کہاں ہے۔ میں تو اسے آپکے کمرے میں ڈھونڈنے آئی تھی اور پھر دونوں کمرے کے باہر ہو گئیں۔

اور پھر یہ سعیدہ" رضیہ کے بھائی بولے"۔ اس نے مجھے بدنام ہی کر دیا ہے۔ سارے شہر میں سگائی کا چرچا ہو رہا ہے۔ اس ظالم سعیدہ نے تو یہاں تک

کہہ دیا ہے۔ کہ میں تو اب ان کی ہو چکی۔ آگے ان کی مرضی۔ اور جب کبھی وہ راستے میں ملتی ہے۔ تو یوں ہی کھنکھانے لگتی۔ کل کی بات ہے کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ گذر رہی تھی۔ کہ مجھے دیکھ کر کچھ پیچھے ہو گئی۔ میں دم بخود ہو گیا۔ اور کیونکہ سعیدہ کے ساتھ اسکی ماں تھی۔ اسلئے میں کچھ جھجک سا گیا۔ لیکن پاس سے گذرا تو "ہش ہش" کی آواز آئی۔ اور پھر اپنی آنکھوں کا اشارہ کر کے سعیدہ نے مجھے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ تم ہی بتاؤ اصغر۔ کتنا پاگل پن ہے۔ اور میں اسکے پیچھے جا کر کیا کرتا؟

اور پھر یہ پیر کاش جو ہر روز دیال کو ایک خط نوکر کے ہاتھ بھیجدیتی ہے۔ اور بیچارا دیال کیا کرے۔ وہ بھی نوکر کے ہاتھ جواب بھیجدیتا ہے۔ بس خطوں کا سلسلہ جاری ہے۔ خط آتے ہیں۔ خط جاتے ہیں۔ لیکن ملنے کا نام تک نہیں بھلا اس کھیل سے کیا حاصل۔ میں تو ان باتوں سے تنگ آگیا ہوں۔ یہ محبت نہیں یہ درد سر ہے۔ درد سر اگر نہیں تو اس سے اختلاج قلب تو ضرور ہو جاتا ہے ان تمام لڑکیوں نے اپنا اپنا محبوب چن لیا ہے۔ اور جب کہیں اٹھتی بیٹھتی ہیں تو خوب دل کھول کر ہم سب کو .... کرتی ہیں۔ خدا کی قسم ذرا بھی شرم و حیا نہیں آتی اور تو کیا صرف خط لکھنے پر زور۔ اور ملنے کا نام تک نہیں" اور جب بھائی صاحب کی باتیں ختم ہو جاتیں۔ تو ڈرائنگ روم سے کھسر پسر کی آواز آتی اور پھر سرگوشیاں اور کبھی کبھی قہقہے بلند ہوتے اور ڈرائنگ روم ہنسی سے گونج اٹھتا اور جب رضیہ کی سہیلیاں آجاتیں تو بھائی صاحب جھٹ کسی نہ کسی بہانے رضیہ کے کمرے میں آجاتے اور کہتے رضیہ۔ میری کتاب جو کل میں نے خریدی تھی

وہ نہیں ملی۔ دیکھو نہ کہیں تمہارے کمرے میں تو نہیں اور بھلا کیا دھوبی کپڑے
دے گیا تھا۔ جیسے دھوبی کپڑے مجھے ہی دے جاتا ہے۔ بہک بہک سے جاتے ہیں،
اچھا رہنے دو۔ ذرا ٹھہر کر ڈھونڈ لینا۔ ابھی کیا ضرورت ہے اور جاتی دفعہ کنکھیوں
سے میری سہیلیوں کی طرف دیکھتے ہیں۔ اور پھر ڈرائنگ روم میں قہقہوں کا زور۔
کبھی کبھی غالب کا شعر پڑھ دیتے ہیں۔

عشق نے غالب نکما کر دیا

اور جس دن میرے کمرے میں نہ آتے تو شام ہونے پر پوچھتے۔ کیوں رضیہ آج
کون آئی تھی پیلے رنگ کی ساڑی پہنے ہوئے کون تھی۔ میں نے تو اسے آج ہی
دیکھا ہے۔ بھلا یہ کیوں تاکیں میری سہیلیوں کو۔ کیا میں انکے دوستوں کی طرف
دیکھتی ہوں اور یہ دیکھنے کی کب اجازت دیتے ہیں۔ بڑے آئے پاک باز۔ پوچھتے
وقت ایسی شکل بنائیں گے۔ جیسے کوئی ریاضی کا سوال حل کر رہے ہیں لیکن
میں سب کچھ جانتی ہوں کہ اس وقت انکے دل پہ کیا گزرتی ہے اور وہ
کیوں یہ سوال پوچھ رہے ہیں۔

کیوں کیا نام ہے ان کا۔

کس کلاس میں پڑھتی ہیں کس اسکول میں۔

اوہو۔ مجھے مغالطہ ہوا۔ میں نے سمجھا۔ احمد میاں صاحب کی صاحبزادی ہیں۔
یہ تو اور کوئی نکلیں۔ خیر۔ اور چلے جاتے ہیں اور پھر یوں سمجھتے ہیں جیسے میں نے
کچھ سمجھا ہی نہیں۔

اور پھر اسے وہ شام یاد آئی۔ جب وہ اپنی کھڑکی میں کھڑی تھی۔ سورج کی الوداعی کرنیں دور افقی لکیر پر کرہ ارض کو چوم رہی تھیں اور سامنے پہاڑوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا اور انکی چوٹیاں سونے کی برجیوں کی طرح چمکتی تھیں پہاڑوں کے دامن میں ندی کی سیدھی سفید سی لکیر نظر آتی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کسی پہاڑی دوشیزہ کے بالوں کے درمیان ایک مانگ نکالی گئی ہو۔ دور شہر کے باہر کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو ہواؤں میں سما گئی تھی۔ رات کے سائے جاگ رہے تھے اور وہ چپ چاپ کھڑکی میں کھڑی تھی۔ نیچے گلی میں کسی کے پاؤں کی آہٹ آئی۔ تو رضیہ نے دیکھا کہ نیچے ایک نوجوان گذر رہا تھا۔ یکایک اسکی آنکھیں اس سے مل گئیں اور وہ نگاہیں نیم خاموش فضا کو چیرتی ہوئی اسکے دل میں پیوست ہو گئیں، وہ اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اب نوجوان گلی کے سرے پر جا چکا تھا گلی کے خاتمے پر پھر اس نے رضیہ کی طرف دیکھا اور چند لمحے ٹھہر کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ رضیہ کی رگ رگ میں طوفان سا برپا ہو گیا۔ صرف ایک ثانیہ کے لئے دوسرے لمحے اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور اب وہ اپنے احساس پر ہنس رہی تھی پگلی لڑکی کیا ایسے بھی ہو سکتا ہے وہ تو کسی اور کو دیکھ رہا ہوگا شاید ساتھ والے نئے مکان کو۔ یا ساتھ والی کھڑکی میں کسی اور کو۔ لیکن وہاں تو کوئی لڑکی نہیں رہتی اور پھر یکایک اسکی نگاہیں میز پر پڑے ہوئے ٹائم پیس پر پڑیں۔ ”چھ بجکر بیس منٹ“ رضیہ کے لب تھرتھرائے اور اسکے معصوم سے لبوں پر ایک امید بھری مسکراہٹ ہویدا ہوئی اور پھر رضیہ نے کھڑکی کو زور سے بند کر دیا۔

دو ماہ تک کھڑکی کھلتی رہی اور بند ہوتی رہی، وہ لڑکا ہر شام اس گلی میں سے گزرتا۔ اور رضیہ کی طرف دیکھتا اور چلا جاتا اور ان دو مہینوں میں رضیہ کی ہیئت ہی بدل گئی۔ اسے ایسا معلوم ہوا۔ کہ وہ زمین سے اٹھکر آسمان پر چلی گئی ہے۔ اب اس کا دل مسرت سے لبریز تھا، اور گھر کے کام کاج کرنے میں ایک خاص لطف آتا۔ جب وہ صبح اٹھتی۔ تو آنگن میں پنجابرے کے پھول اسکی طرف مسکرا مسکرا کر دیکھتے۔ وہ پھولوں کا گچھا توڑلیتی اور اسے اپنے نرم نرم گالوں سے لگاتی۔ اور پھر ایک دن گلی کے چوکیداروں نے رضیہ کے باپ سے کہہ ہی دیا۔ جو انہیں کہنا تھا۔ پھر اسدن کے بعد سے کھڑکی بند ہوگئی اور رضیہ کو ایسا معلوم ہوا کہ یہ کھڑکی کبھی نہ کھلے گی۔ باپ کی نگاہیں کہہ رہی ہیں" بیٹی۔ ہندوستانی لڑکی محبت نہیں کرسکتی۔ وہ صرف شادی کرتی ہے اور اسکی ماں کی نگاہیں کہہ رہی تھیں تم نے ہمارے ناموس کو بٹا لگادیا۔ ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔ اپنے ماں باپ کی عزت کا کچھ خیال تو کرتیں اور بھائی کی نگاہیں کہتی تھیں۔ آزادی کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم بھی ہنو کے بنائے ہوئے راستے پر چلو، یہ راستہ کانٹوں سے لبریز ہے اور پھر میں کبھی یہ گوارا نہیں کرسکتا۔ کہ میری بہن سے کوئی عشق کرے۔ گو میں چاہتا ہوں کہ میں دوسروں کی بہنوں سے عشق کروں۔ ان سے ہنسوں کھیلوں ......
لیکن جی چاہتا ہے۔ تمہارا گلا گھونٹ دوں۔

اور پھر ایک دن رضیہ کو خیال آیا۔ کہ وہ ان بندشوں کو توڑدے۔ ان آہنی سلاخوں کو ریزہ ریزہ کردے۔ جنہوں نے اس کیبل کو ہمیشہ کے لئے بند کردیا ہے۔ وہ اسے اس وسیع دنیا میں کہیں نہ کہیں ڈھونڈے گی۔ لیکن پھر اسے خیال

آنا۔ کہ وہ کہاں ہو گا۔ وہ کیوں چلا گیا۔ اور اب وہ کیوں نہیں آتا۔ وہ آج تک گھر سے باہر کبھی اکیلی نہیں نکلی۔ وہ اکیلی کدھر اور کہاں جائے۔ دنیا اتنی وسیع اور اتنی پھیلی ہوئی ہے۔ یہ اونچے اونچے پہاڑ۔ یہ رات کے لمبے لمبے ڈراونے سائے۔ یہ بے معنی اور اونچے اونچے پر اسرار درخت اور یہ سانپ کی کینچلی کی طرح بل کھاتا ہوا دریا۔ یہ بندش، یہ آہنی بندشیں، یہ ابدی بندشیں۔ یہ کب ٹوٹیں گی یہ کہاں ٹوٹتی ہیں۔

اور جب سے گھر والوں کو اس راز کا علم ہوا ہے۔ انہوں نے کھسر پھسر شروع کر دی ہے۔ ہر روز خفیہ میٹنگیں ہوتی ہیں۔ اور رضیہ سوچتی ہے اور خوب سمجھتی ہے کہ ان سرگوشیوں کا کیا مطلب ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ اسے جلد ہی ہندوستانی سماج کے لنگر ڈبونے والا لنگر کے ساتھ ڈوب جانا ہو گا۔
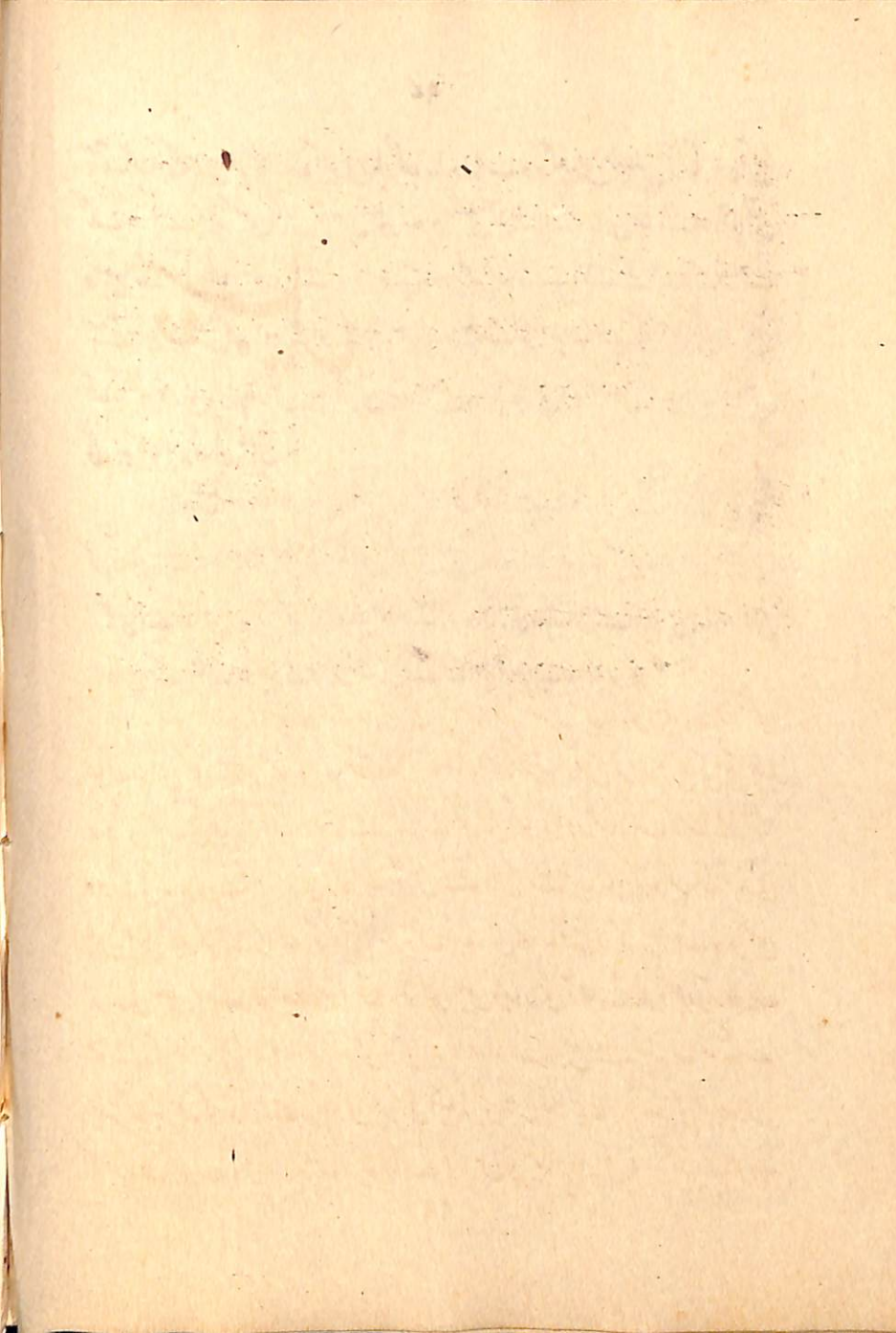
دو بیل

رات آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔ اور دُور مشرق میں افقی لکیر پر روشنی جاگ رہی تھی۔ جوں جوں وقت گذرتا جاتا تھا کرّہ ارض پر سورج کی ہلکی سفید روشنی چھاتی جاتی تھی۔ بوڑھے احمدؔ نے کھڑکی کھولی اور جھانک کر سامنے نگاہ دوڑائی۔ پورے بیس دن کے بعد اُس نے اس کھلے میدان کو دیکھا تھا۔ زندگی میں پہلی بار بوڑھے احمد کو اتنی خطرناک بیماری کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں بہت کم بیمار ہوا تھا۔ غریبی میں بیماری آجائے تو سمجھو کر غریب موت کی نذر ہوا۔ بھلا جو آدمی دن بھر کام کرے، صبح سے لیکر شام تک سڑک پر پتھر کوٹتا رہے۔ یا دن بھر کسی فیکٹری میں گذارے، یا گندی نالیوں کو صاف کرے، بھلا وہ بیمار ہو جائے تو اس کی تیمارداری کون کرے۔ اور

تیمارداری کے لئے روپیہ چاہیئے۔ اور روپے کے لئے محنت۔ بیماری میں محنت کب ہو سکتی ہے۔

بوڑھے احمد نے اُٹھنا چاہا، لیکن ٹانگیں لڑکھڑا گئیں۔ بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی اور کانوں میں سائیں سائیں کی سی آوازیں آنے لگیں۔ کھانسی زکام اور تیز بخار نے اس کا تمام خون چوس لیا تھا۔ اور اب وہ اس گنّے کی طرح سوکھا اور سکڑا ہؤا معلوم ہوتا تھا جس کا رس نچوڑ لیا گیا ہو۔ بدن ہڈیوں کا ڈھانچا رہ گیا تھا۔ اور چہرے پر سیاہی مائل رنگت چھا گئی تھی۔ گو آج بخار اور زکام سے آرام تھا۔ لیکن کھانسی بدستور تھی۔ یہ سالی کھانسی نہیں چھوڑتی۔ کسی دن جان لے کر رہے گی۔ اور کھانستے کھانستے اسکی چھاتی دُکھنے لگتی۔ آنکھیں انگارے کی طرح لال ہو جاتیں۔ اور چہرے پر زردی چھا جاتی۔ لیکن آج بوڑھے احمد کو کچھ افاقہ تھا۔ کھڑکی سے مڑ کر اس نے کمرے پر نگاہ ڈالی۔ کمرے کی حالت دیکھکر اسے بہت کوفت ہوئی۔ ہر طرف پھٹے پرانے کپڑے، ٹوٹے ہوئے برتن، پھٹی ہوئی دریاں، گندے لحاف اور ہر طرف اسکے بلغم کے نشان۔ کمرے کی دیواروں پر، زمین پر، کپڑوں پر، برتنوں پر۔ وہ کیا کرتا رہا ہے۔ سوائے تھوکنے کے اُسے کوئی کام نہ تھا۔ اس نے باہر کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ آسمان کتنا صاف اور نیلا تھا۔ دُور مشرق کی طرف سفید براق بادل ہوا میں تیر رہے تھے۔ ہوا کتنی خوشگوار اور بھلی معلوم ہوتی تھی گو وہ اس ہوا سے بچنا چاہتے تھے۔ کیونکہ ہوا ٹھنڈی تھی۔ اس لئے اُسے اندیشہ لاحق تھا کہ کہیں بیماری کا دوبارہ حملہ نہ ہو جائے۔ یہ ہو ذی نمونیہ کمرے

کی اس غلاظت اور گھٹتے ہوئے ماحول کو دیکھکر بڑھے گا۔ احمد کو اپنے افلاس کا تلخ احساس ہؤا۔ اُسے معلوم ہؤا آج اس کا دیوالہ نکل گیا ہے اور شاید یہ ٹھیک بات تھی۔ اس بیماری میں اس کا تمام اثاثہ لگ گیا۔ پہلے اس کا اثاثہ کتنا تھا۔ وہ کتنا بچا سکتا تھا۔ یہی کچھ روپیہ۔ صرف روپے، یا بانو کے چاندی کے گہنے۔ بانو نے اس دفعہ اپنی چاندی کے گہنوں کو بھی بیچدیا تھا۔ بیچاری بانو۔ اگر بانو نہ ہوتی تو وہ کب کا قبر میں ہوتا۔ بیچاری نے کتنی تن دہی سے اس کی تیمارداری کی تھی۔ دن رات ایک کردیا تھا کئی راتیں جاگ کر کاٹیں۔ دوادارو خود دلاتی رہی۔ اس رات کو وہ کب بھول سکتا ہے، جب اسکے سینے میں زبردست درد اُٹھا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے پھیپھڑوں میں ایک خنجر چبھو دیا گیا ہے۔ رات کے اندھیرے میں اُس نے اپنے آپ کو قابو میں لانا چاہا۔ لیکن درد بڑھتا گیا۔ آخر وہ چلانے لگا۔ اور بیچاری بانو خدا اس کی عمر دراز کرے، وہ غریب رات کے دو بجے جاکر دوائی لائی، اور اُسے پلائی، تب جاکر کہیں آرام ہؤا۔ کتنا ایثار ہے، کتنی بے لوث محبت ہے۔ بیچاری بانو اس افلاس نے اُسے کتنا نحیف کر دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غربت کے بے رحم خدا نے اسکے جسم کی تمام خوبیوں کو فنا کردیا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے پچیس سال پہلے کی تصویر کھچ گئی۔ جب بانو پہلی بار اسکے گھر دُلہن بن کر آئی تھی، وہ لال رنگ کا لہنگا پہنے ہوئے تھی اور پیازی رنگ کی انگیا، اور یہ لمبا گھونگھٹ، جس میں اس کی شوخ نگاہیں اسے جھانک رہی تھیں۔ اسکے

آنے سے گھر میں روپے پیسے کی ریل پیل ہو گئی تھی۔ بھلا گھر میں لکشمی آئے اور دولت مُنہ نہ چُومے۔ اتنا کام کرنے کو ملتا تھا کہ اسے کام سے انکار کرنا پڑتا تھا۔ اور بانو کا بھرا بھرا سا جسم باہوں کا گدازپن، اور چہرے کے متناسب خد و خال، گو اس کا رنگ کالا تھا لیکن وہ کونسا گورا چٹّا تھا۔ اور پھر اس کی آواز میں اتنی مٹھاس تھی جو اُس نے چاؤڑی بازار کی طوائفوں میں کبھی نہ پائی تھی۔ اور آج بانو کیا رہ گئی ہے۔ ہڈیوں کا ایک ڈھانچا۔ آنکھوں کی چمک غائب۔ باہوں کا گداز معدوم۔ آواز میں کرختگی اور چال میں نقاہت۔ بوڑھا احمدؔ کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ کسی کے پاؤں کی آہٹ آئی۔ سامنے دیکھا تو بانوؔ کھڑی تھی۔ ایثار اور محبت کا مجسّمہ۔ حسین اور خوبصورت جوان اور رسیلی۔ بوڑھے احمدؔ نے اپنے سر کو زور سے جھٹکا دیا۔ اور آنکھوں کو اپنے ہاتھوں سے ملا اور پھر بانوؔ کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔

"جانتے ہو۔ آج کھانے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔ بچّہ صبح سے رو رہا ہے۔ اور تم بستر پر سے . . . . . . "

"بانوؔ میرے قریب آؤ"

"کیوں کیا کہتے ہو"

"یہی کہ میں جھکڑا لے کر بازار میں جاؤنگا۔ میں سِسک سِسک کر مرنا نہیں چاہتا"

بانو نے گردن ایک طرف جھکالی اور آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ اور پھر سسکیاں بھر کر رونے لگی۔

"میرے پاس جو کچھ تھا تمہاری بیماری پر لگا دیا۔ حتیٰ کہ اپنے گہنے بھی بیچ ڈالے۔ اب کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔ بازار میں گئی تھی کہ کوئی کام مل جائے۔ لیکن بڑھیا کو دیکھ کر کون کام دیتا ہے۔ چھکڑا چلانا تو آتا نہیں ورنہ خود چلی جاتی۔ ....." اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گئی۔

"بانو گھبراؤ مت۔ جب تک زندہ ہوں تم بھوکی نہ رہو گی۔ اللہ کی قسم جب تم روتی ہو تو میرا کلیجہ چھلنی ہو جاتا ہے۔ اور اگر تم زیادہ روئیں تو میں اسی وقت چھکڑا لیکر باہر چلا جاؤنگا۔"

"لیکن تم جاؤ گے کس طرح۔ کیا چھکڑا چلا لو گے کیا اتنی طاقت ہے؟ ......"

"آخر کیا کیا جائے۔ بھوک سے مرا تو نہیں جاتا۔"

اتنا کہہ کر بوڑھا احمد اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کی بوڑھی رگوں میں ایک توانائی سی آگئی۔ گھر میں بھوک سے سسک سسک کر مرنے سے یہ بہتر ہے کہ ان بوڑھے ہاتھوں سے کچھ کام کیا جائے۔ جب وہ گھر سے باہر نکلا اُس کی نگاہ اپنے بیل پر پڑی۔ جو میدان میں ننگ دھڑنگ کھڑا تھا۔ وہ اس درخت کی طرح تھا کہ جس کے سائے تلے ہزاروں سستاتے ہوں۔ لیکن اسے کوئی فائدہ نہ پہنچاتے ہوں۔ بیل دو دن سے بھوکا تھا۔ مالک کو دیکھکر اُس نے کان کھڑے کئے۔ بیل کے نتھنے پھول گئے۔ ٹانگیں ہلنے

ٹانگیں اور دم کو اپنے کھردرے جسم پہ پھیرتے ہوئے اُس نے اُمید بھری نظروں سے بوڑھے احمدؔ کی طرف دیکھا۔ جیسے کہ وہ کہہ رہا ہو۔ کچھ تو دو۔ دو دن کا بھوکا ہوں۔ لاؤ کیا لائے ہو۔

بوڑھا احمدؔ بیل کے پاس جا کر چُپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ وہ نہیں سمجھتا تھا کہ وہ اس بے زبان جانور سے کس طرح اپنے دل کا حال کہے احمدؔ نے بیل کی آنکھوں میں نمی کی جھلک دیکھی۔ اس کا دل کانپنے لگا۔ وہ کیا کرے۔ اس بیل نے زندگی بھر مدد دی ہے۔ یہ بیل کبھی بیمار نہیں ہوا۔ اور ہمیشہ کام کرتا رہا ہے۔ لیکن یہ بھی دو دن سے بھوکا ہے۔ اسکی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ شاید اسکے ایمان کی دیواریں بھی شکستہ ہو گئی ہیں۔

بوڑھے احمدؔ کو اس بیل سے بہت محبت تھی۔ یہ بیل اس کا رونزی سال تھا۔ یہ ابھی چھوٹا بچھڑا ہی تھا کہ احمدؔ نے اُسے خرید لیا تھا۔ بوڑھے احمدؔ نے اپنے ہاتھوں سے اُسے کھلایا، پلایا، پالا پوسا، اور بڑا کیا۔ جب تک احمدؔ کی زندگی میں بانو وارد نہ ہوئی تھی۔ احمدؔ بیل کو منّو منّو کہہ کر پکارتا تھا۔ اُسے اس بیل سے محبت سی ہو گئی تھی۔ ایک مجنونانہ محبت۔ جس دن احمدؔ پیسے زیادہ کماتا، تو وہ منّو کو خوب کھلاتا۔ اس کے جسم پر مالش کرتا اور اس سے ہنسکر باتیں کرتا اور جب کبھی رات کی تاریکی میں وہ اکیلا ہوتا تو وہ منّو کے پاس چلا جاتا اور گھنٹوں اس کے پاس بیٹھتا۔ کبھی کبھی منّو اس کے سر کو چاٹنے لگتا تھا۔ جیسے کوئی نرم نرم انگلیوں والی لڑکی اس کے سر کو سہلا رہی ہو۔ لیکن بانو کے آنے سے اس کی زندگی میں ایک نمایاں

تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن اس جانور اور احمد کے درمیان جو محبت کا رشتہ پیدا ہو گیا تھا وہ ٹوٹنے کا نہ تھا۔ گو وہ منّو کو اب اس شدت سے پیار نہ کر سکتا تھا۔ کیونکہ بانو کی سیلی باتیں منّو کی ابدی خاموشی سے کئی درجے بہتر تھیں۔ وہ یہی باتیں سوچ رہا تھا کہ بیل نے پیر مارنے شروع کئے شاید وہ کہہ رہا تھا "بوڑھے میاں ماضی کے اوراق کیوں پلٹتے ہو۔ جانے بھی دو۔ مجھے بھوک لگی ہے۔ تم کس سوچ میں ہو"!

احمد نے بیل کو چھکڑے میں جوتا۔ اور بیل چھکڑے کو آہستہ آہستہ کھینچنے لگا۔ نہ بوڑھے احمد میں اتنی ہمت تھی کہ بیل کو تیز کر دیتا، اور نہ بیل میں اتنی سکت تھی کہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا۔ سورج نصف النہار پر آچکا تھا۔ گو سردیوں کے دن تھے۔ لیکن کافی گرمی ہو گئی تھی۔ بوڑھے کے کھوکھلے جسم میں یہ دوپہر کی کڑکتی ہوئی دھوپ بجلی کی مانند سرائت کرنے لگی۔ اسکے تمام جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ شاید یہ دھوپ کا اثر تھا۔ وہ منڈی کو سے ہوتا ہوا اسٹیشن کی طرف بڑھا۔ پاس سے ایک جوان خوبصورت گھسیارن سرخ لہنگا پہنے ہوئے گزری۔ چال میں بلا کی شوخی، آنکھوں میں بے پناہ کشش۔ وہ دیر تک گھسیارن کی طرف دیکھتا رہا۔ حتی کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اُس نے سوچا کبھی میری بانو بھی ایسی ہی تھی۔

بوڑھے احمد نے دُور سے آنے والے ایک چھکڑے کی طرف نگاہ ڈالی چھکڑا سبزی سے بھرا ہوا تھا۔ سبزی کو دیکھتے ہی بیل کے قدموں کی

رفتار تیز ہو گئی۔

بوڑھے احمد نے بیل کو پچکارتے ہوئے کہا " یہ سبزی تمہارے لئے نہیں یہ سبزی انسانوں کے لئے ہے "!

متواتر چار گھنٹے تک بوڑھا بیل کو ہانکتا ہوا اِدھر اُدھر کام کے لئے گھومتا رہا۔ دھوپ میں چلنے پھرنے سے اس کا بوڑھا دماغ چکرا گیا تھا اس بیماری نے پھیپھڑوں کو کیا دماغ تک کو کمزور کر دیا تھا۔ صبح سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ بیماری کی کمزوری اور نقاہت کیا کم تھی کہ بھوک اور فاقے نے اُسے نڈھال کر دیا۔ اب شام ہونے کو تھی۔ ہوا میں کچھ خنکی سی آ گئی تھی۔ کبھی کبھی جب ٹھنڈی ہوا اُس کے سینے سے ٹکراتی تو اُسے کھانسی کا دورہ پڑ جاتا اور وہ چھکڑے پر ہی کھانسنے لگتا۔ حتیٰ کہ اس کی آنکھیں باہر نکل آتیں۔ مُنہ انگارے کی طرح گرم ہو جاتا اور کنپٹیاں جلنے لگتیں۔ اور بچارا بیل حیران ہو جاتا کہ آج میرے مالک کو کیا ہو گیا ہے۔

جوں جوں شام کی تاریکی بڑھتی جاتی، اُس کے دل کی اُداسی بڑھتی جاتی تھی۔ بوڑھے احمد کو روشنی اچھی لگتی تھی۔ یہ اندھیرا یہ ابدی اندھیرا زندگی کو تاریک کر دیتا ہے۔ پھیپھڑوں کو جلا دیتا ہے۔ ہوا کو غلیظ کر دیتا ہے۔ محبت کو بے زبان اور جوانوں کو جوانی میں بوڑھا کر دیتا ہے۔ یہ اندھیر نہیں، موت کی نشانی ہے۔ اسے روشنی اچھی لگتی ہے۔ اور وہ روشنی میں کام کر سکتا ہے۔ لیکن آج کام نہیں ملتا۔ لوگ کہتے ہیں۔ جنگ زوروں پر

ہے، روزگار عام ہے۔ یہاں سے مال باہر جاتا ہے۔ باہر سے مال یہاں آتا ہے۔ لیکن پھر بھی کام نہیں ملتا۔ اور یہی ٹھنو تو کہتے تھے کہ آج کل چھکڑے والوں کی ریل پیل ہے۔ آدمی کام کرنے والا ہو، دن میں بیسیوں روپے کما سکتا ہے۔

شام کی تاریکی رات کی سیاہی میں مبدّل ہو گئی۔ آسمان پر ستارے چمکنے لگے۔ سڑکوں پر بجلی کے قمقمے روشن ہو گئے۔ اور اب بوڑھے احمد نے سوچا کہ اُسے واپس گھر چلنا چاہیئے۔ کہیں ایسا نہ کہ کارواں راستے میں رہ جائے۔ اور اس میں طاقت نہ رہے کہ وہ اپنے آخری لمحے اپنے گھر پر گذار سکے۔ وہ سوچتا تھا کہ وہ بانو سے کیا کہے گا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اتنی وسیع زمین پر اُسے کام نہیں ملتا۔ لوگ بے تحاشہ اِدھر اُدھر بھاگے جا رہے ہیں۔ یہ ٹرامیں بسیں یہ لاریاں کدھر جا رہی ہیں یہ لوگوں کا ہجوم یہ رنگ رلیاں، یہ سبز ساڑھیاں، یہ موٹریں، یہ تانگے، یہ گھوڑے، پالکیاں، یہ پھل پھولوں کی دُکانیں، یہ سبزیوں کے چھکڑے، یہ آٹے کی بوریاں، گندم کے گرام، گھی کے پیپے کہاں جاتے ہیں۔ یہ کہاں صرف ہوتے ہیں۔ وہ کیوں بھوکا ہے۔ اس کی بانو کیوں بھوکی ہے، اس کا بچّہ کیوں بھوکا ہے۔ اس کا بیل کیوں بھوکا ہے۔ اس نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ ستارے مُسکرا رہے تھے۔ اسے نہایت غصّہ آیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اُسکے پاس اتنی لمبی مشعل ہو کہ وہ ان مسکراتے ہوئے تاروں کا مُنہ جھلس دے۔ صدیوں سے غریب کی غربت

پر مُسکرائے جاتے ہیں ۔ بے شرم، ڈھیٹ ، بے حیا ۔
یکایک فضا کو چیرتی ہوئی ایک آواز آئی "او جھکڑے والے"
بوڑھے احمد نے مڑ کر ایک موٹی توند والے انسان کو دیکھا ۔
"کام کرو گے"
"کیوں نہیں حجور"
"دس من سامان ہے ، کیا لو گے"
"دس آنے حجور"
"پانچ آنے ملیں گے" اور موٹی توند والا آگے بڑھ گیا ۔
"ٹھہریئے بابو صاحب ، مجھے پانچ آنے منظور ہیں"
"اچھا تو اسٹیشن پر جاؤ ۔ گودام میں دس بوریاں ہونگی ۔ یہ لو فارم اسے سنبھالو ۔ یہ کاغذ دیکر بوریاں لے آنا ۔ سیدھے چاندنی چوک رام رکھامل کی دکان پر پہنچانا"
بوڑھا احمد یہ کام پاکر خوش ہوا ۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُسے قارون کا خزانہ مل گیا ہے ۔ بجھتے ہوئے دیئے میں ایک بُوند تیل کی بھی دیئے کی زندگی کو بڑھا دیتی ہے ۔ اور بوڑھا احمد اپنی زندگی کو بڑھانا چاہتا تھا یہ پانچ آنے نہیں پانچ روپے ہیں ۔ آج خدا نے اسکی دُعا سُن لی ہے وہ چھ پیسے سے بیل کے لئے گھانس خریدے گا ۔ دو پیسے کا بچّے کے لئے دودھ ۔ دو آنے کے چنے اور ایک آنے کا گڑ ۔ لو اس کا کھانا تیار ہو گیا ۔ لیکن لوگ یہ کھانا بھی چھینا چاہتے ہیں ۔ وہ چاہتے ہیں کہ غریب ہوا میں

رہے، ہوا کھائے اور ہوا پھنے۔ بوڑھے احمد نے بیل کی رسّی کھینچی اور بیل دوڑنے لگا۔ شاید بیل سمجھ گیا تھا کہ یہ اُس کی آخری دوڑ ہے۔ اگر آج اس میں رہ گیا تو وہ کہیں کا نہ رہے گا۔ وہ موڑ گذر کر داہنے ہاتھ کی طرف جانے لگا۔ یہاں سڑک پر روشنی کم تھی۔ اور درختوں کی پھیلی ہوئی ٹہنیوں نے سڑک کو اور بھی تاریک کر دیا تھا۔ سڑک پر سنّاٹا تھا۔ یا کبھی کبھی دُور سے لاری کے ہارن کی آواز آتی تھی۔ ہوا سرد اور بھاری ہو چلی تھی۔ سامنے کی طرف دھوئیں کا غبار تھا جو آنکھوں کو چُندھیائے دیتا تھا۔ بوڑھا احمد سردی کی وجہ سے سکڑ کر بیٹھا ہُوا تھا۔ ٹانگوں کو اکٹھا کر کے وہ سر کو ٹانگوں سے مِلاتے ہوئے ایک عجیب انداز میں بیٹھا ہُوا تھا کہ کسی کی آواز آئی "ٹھہراؤ چھکڑے والے ــــــــ"

آواز بھاری تھی اور ہوا میں گونجتی ہوئی ـــ آواز میں ایک قسم کا رُعب تھا۔ جو یکلخت بڈھے کے جسم پر طاری ہو گیا۔ ہاتھ رک گئے اور ایسا معلوم ہُوا کہ جیسے کسی غیبی طاقت نے اُس کے ہاتھ شل کر دیئے ہیں۔ اس نے بائیں طرف دیکھا تو ایک لحیم شحیم سپاہی کھڑا تھا سپاہی نے عقابی نظروں سے بوڑھے کو تاکا۔ اور پھر بیل پہ ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ یکا یک سپاہی کی نظریں بیل کی ٹانگوں پہ جم گئیں۔ اور پھر اس کی آنکھوں میں معنی خیز شرارت ٹپکی۔ اب وہ اس جرنیل کی طرح تھا، جس نے ایک عظیم الشان مہم سر کی ہو۔ اُس نے بوٹوں کی ایڑیوں پر کھڑے ہوتے ہوئے کہا "کیوں رے بڈھے! تجھے شرم نہیں آتی کہ اس غریب جانور

پر اتنا ظلم ڈھاتا ہے۔"

"حضور کیا بات ہے؟"

"حضور کا بچہ۔" سپاہی نے کڑک کر کہا۔ اس کی کڑک میں حکومت کی طاقت پنہاں تھی یہ خود کھا کھا کر موٹا ہوتا جا رہا ہے۔ اور دیکھتا نہیں بیل کی طرف کتنا دُبلا پتلا ہے۔ بے زبان جانور پر تشدّد کرتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی۔ دیکھ اسکے پاؤں کی طرف۔ خون بہے جا رہا ہے۔ کیا آنکھوں سے اندھا ہے۔ بینائی ختم ہو چکی ہے۔"

"حضور آپ مائی باپ ہیں۔ بھلا دیکھوں تو کہاں سے خون بہہ رہا ہے۔ صبح تو بھلا چنگا تھا۔"

"دیکھو اس پاؤں کی طرف۔"

سپاہی نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ اور کسی کو نہ پا کر بوڑھے کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ یہ نگاہیں کچھ مانگ رہی تھیں ——

بوڑھا اس بے زبان انسان کی بات سمجھ گیا۔ لیکن بیچارہ کیا کر سکتا تھا۔ اسکے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ اور اگر ہوتی تو آج اس نقاہت اور کمزوری میں گھر سے باہر کیوں نکلتا۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "حضور آج کچھ نہیں ہے۔ کل آپ کی نذر کر دونگا۔"

سپاہی کی آنکھوں میں سے شرارے نکلنے لگے۔ اس کا مُنہ غصّے سے لال ہو گیا۔ اُس نے بوڑھے کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھا اور زمین

پر تھوکتے ہوئے کہا "بے زبان جانوروں پر ظلم کرتے ہو۔ جی چاہتا ہے تمہارا بھیجا نکال دوں۔ حرامی۔ بوڑھا کھوسٹ۔ میں ابھی بتاتا ہوں کہ جانوروں پر ظلم کرنے سے کیا سزا ملتی ہے۔" سپاہی نے بوڑھے کو چھکڑے سے نیچے اُترآنے کو کہا اور بیل کو چھکڑے سے علیحدہ کرکے آگے ہانکنے لگا۔ "رہنے دو۔ چھکڑے کو یہیں رکھو۔ تم لوگ جانوروں پر ظلم کرنے سے باز نہیں آؤگے۔ جب تک تمہیں پوری سزا نہ ملے۔"

دوسرے دن جب بوڑھا احمد اللہ دلے رحمی کے محکمے میں گیا تو اُسے معلوم ہوا کہ بیل ہسپتال میں معائنے کے لئے بھیجدیا گیا ہے۔ اس لئے اُسے بے رحمی کے ہسپتال میں جانا چاہیئے۔ وہ خود حیران تھا کہ وہ کیا کرے اگر اس کا بیل اس سے چھن گیا۔ تو وہ کیا کریگا۔ زندگی کی آخری کرن ہمیشہ کے لئے مفقود ہو جائے گی۔

جب وہ بے رحمی کے ہسپتال میں پہنچا تو اُس نے اپنے سامنے ایک گورے چٹے انسان کو دیکھا۔ جو ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کی آنکھوں پر عینک لگی ہوئی تھی۔

"کیا یہ تمہارا بیل ہے؟"

"جی حضور" بوڑھے نے بیل کی طرف نگاہ ڈالی۔

"ہم نے اس کا معائنہ کیا ہے۔ اس کے خون میں تپدق کے جراثیم ہیں۔ تم لوگ بہت بدمعاش ہے۔ بہت بے رحم ہے۔ کتنا ظلم کرتا ہے جانوروں پر۔ یہ جانور تمہیں روٹی دیتا ہے۔ لیکن تم اسے مارتا ہے اور دن رات

بھوکا رکھتا ہے۔ اسے پوری خوراک نہ ملنے کی وجہ سے یہ بیماری لگ گئی ہے۔"

"حضور ایسی بات تو نہیں ہے۔ میرا بیل بھلا چنگا ہے۔ اسے کوئی بیماری نہیں ہے۔ کل تک یہ راجی خوشی تھا۔ سرکار بیمار تو میں ہوں۔ بلیس دن سے بیمار ہوں۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ میری بیوی بھوکی ہے۔ میرے بچے بھوکے ہیں۔"

ڈاکٹر نے غضبناک ہو کر کہا "کیا ہم جھوٹ بولتا ہے ——— بے شرم کہیں کا۔ چپڑاسی اس بوڑھے آدمی کو دھکے دے کر باہر نکال دو۔ اس بیل کو ہسپتال میں پہنچا دو۔ اور وارڈ میں داخل کر دو۔ اس کا علاج ہم کریں گے۔"

"حضور ہم بھوکے مر جائیں گے۔ میری بیوی میرے بچے۔"

"سرکار تمہارے بال بچوں کی ذمہ دار نہیں۔ ہم کیا کریں۔ نکل جاؤ۔ چپڑاسی نکال دو اس بوڑھے کو۔"

اور جب بوڑھا احمد دروازے سے نکلا تو اس نے سوچا کہ کیا اس دنیا میں کوئی ایسا ہسپتال نہیں ہے جہاں ان انسانوں کو داخل کیا جائے جن پہ بے رحمی کی جاتی ہے۔ وہ اب اکیلا تھا۔ بالکل تنہا۔ اس درخت کی طرح۔ جو صحرا میں اکیلا ہو۔ اس نے جانا کہ وہ اس پرندے کی طرح ہے جس کے پر ہمیشہ کے لئے کاٹ دیئے گئے ہیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دنیا گھومتی ہوئی نظر آئی۔

اس کے کانوں میں ٹراموں، اکاروں اور رکشاؤں کی ٹن ٹن کی آوازیں تھیں۔ لیکن یہ شور لحظہ بہ لحظہ کم ہوتا گیا۔ وہ اب اس زمین کے قریب جا رہا تھا، جہاں ابدی اندھیرا ہو جاتا ہے۔ اور روشنی کی کرن ہمیشہ کے لئے معدوم ہو جاتی ہے۔

بغاوت

وہ سوچتی رہتی اور سوچتے سوچتے تھک جاتی تھی کہ اسکا دماغ سوچنے سے انکار کر دیتا۔ لیکن دماغ پر انکار کی چوٹیں پڑتی رہتیں، تب بھی وہ سوچتی رہتی اور کبھی کبھی وہ سمجھتی کہ کہیں وہ پاگل نہ ہو جائے۔ لیکن پھر اسے خیال آتا کہ ہر صحیح الدماغ انسان سوچتا ہے تو وہ کیوں نہ سوچے وہ اپنے ماضی کے متعلق سوچتی اور اسے معلوم ہوتا کہ اس کا ماضی واقعات سے اتنا خالی رہا ہے کہ اسکے متعلق سوچنا وقت ضائع کرنا ہے اور پھر وہ مستقبل کے متعلق گھوڑے دوڑاتی۔ اور اسے معلوم ہوتا کہ اس کا مستقبل ماضی سے بھی زیادہ تاریک ہے۔ اور حال صرف بے جان بے لذت اور بے کیف تھا۔ اسے سوچنے سے کبھی ڈھارس نہ ہوتی اور ہوتی بھی کیسے اسکی زندگی کی شمع اکیلی جلتی رہتی اور کتنی عجیب بات تھی کہ ایک

پروانہ بھی نزدیک نہ پھٹکا جو اسکی روکھی پھیکی زندگی کو پرکیف بنا سکتا۔ گھر سے اسکول اور اسکول سے گھر یہی اس کی زندگی تھی، یہی اس کا محور تھا جس کے گرد اس کی بے لذت زندگی ہچکولے کھاتی ہوئی، چکر لگا رہی تھی، اکثر دن کی روشنی میں اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ جاتا، اور جو کچھ وہ رات کو سوچتی وہ سورج نکلتے ہی ہوا میں تحلیل ہو جاتا۔ لیکن رات ہوتے ہی اسکے احساس میں ایک جان آجاتی۔ اس کا دماغ خیالات سے منوّر ہو اُٹھتا اسکی پلکیں خوابوں سے بھاری ہو جاتیں۔ اور تصوّرات کی ایک نئی دنیا بن جاتی لیکن کچھ عرصہ سے اسے ان خیالات سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ ہر نئی چیز سے انسان کو محبت ہوتی ہے۔ جب پہلی بار یہ تصورات، یہ رنگین دنیا، یہ قوس و قزح اُس کی بے لذّت دنیا کے حصّہ بنے تو اس نے سمجھا۔ کہ وہ آبِ حیات پی رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک خمار سا رہتا۔ اُس کی پلکیں نیند سے مدہوش رہتیں اور آنکھوں میں شگفتگی اور چمک سی آجاتی۔ لیکن انسان کا ہر دلکش خواب جلد ٹوٹ جاتا ہے۔ ہر قلعہ مسمار ہو جاتا ہے اس نے ہر طرح کوشش کی کہ یہ تصوّرات ٹوٹنے نہ پائیں، یہ خیالات بالا متناہی سلسلہ ہمیشہ کے لئے چلتا رہے۔ لیکن جوں جوں وہ جوان ہوتی گئی، یہ خیالات بھاری پتھر بنکر اس کے سینہ پر بوجھ ڈالنے لگے۔ اکثر وہ چاہتی کہ کسی طریقہ سے اُسے اُن خیالات سے رہائی مل جائے۔ لیکن خیالات کا بوجھ اس کے کندھوں پر ایک مردہ لاش کی طرح گلنے اور سڑنے لگا۔ ان چند باتوں نے اسے شدید طور پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ شدّت سے سوچے۔ لیکن آج کے واقع

نے اسے جاگنے پر مجبور کر دیا تھا، وہ کچھ اور ہی سوچنا چاہتی تھی کچھ اور ——
جو اس سے پہلے اس کے ذہن میں نہ آتا تھا۔ اگر آیا بھی تھا تو لاشعوری طور
پر جس کا اُسے علم نہ تھا۔ وہ مبہم سے خیالات وہ جو اسکے دماغ کی چوکھٹ پر
خفیف سی چوٹیں لگا رہے تھے۔ آج یکایک ابھر آئے اور اسکے دل و دماغ
پر چھا گئے۔ وہ بستر پر لیٹی ہوئی کروٹیں لینے لگی، تاکہ خیالات کا سلسلہ ٹوٹ
جائے اور اسے نیند آ جائے لیکن آج نیند کہاں اس نے اپنی آنکھوں کو ملا
اور پھر زور سے آنکھیں کھول دیں۔ لیکن خیالات برابر چکر لگا رہے تھے
اس نے اپنے سر کو زور سے جھٹکا، پھر باہوں کو جھٹکا اور زور زور سے پاؤں
ہلانے شروع کئے۔ لیکن آج اُسکے خیالات ایک فیصلہ کن راستہ اختیار
کر رہے تھے۔ وہ چلاّنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ ڈر گئی کہ ناگہاں گھر کے افراد جاگ
اٹھیں اور لعنت ملامت کریں۔ اگر وہ چلاّئی اور گھر کے افراد جاگ اٹھیں
تو وہ کیا جواب دے گی —— کیا وہ ڈر گئی ہے۔ وہ بچی تو نہیں جو وہ
اکیلی بستر پر لیٹی لیٹی ڈر جائے۔ اس نے خیال کیا کہ اُسے چپ چاپ بستر
پر لیٹ رہنا چاہیئے۔ اس نے تاریکی کو آج اپنے گرد لپیٹنا چاہا۔ اس نے
تصوّرات کو پھر ہلانا چاہا۔ قوس و قزح کی رنگینیاں اس کی آنکھوں کے
سامنے ناچتی رہیں۔ لیکن پل بھر اور دوسرے لمحہ میں وہ فیصلہ کن راستہ تاریکی
کو چیرتا ہوا آگے بڑھ جاتا، آج تاریکی خود بخود راستہ دکھا رہی تھی لیکن
آج اس میں لذتیں نہ تھیں دلبستگی کا سامان نہ تھا۔ سانس کی روانی تیز نہ تھی
گالوں میں حدت نہ تھی۔ لبوں پر لعاب نہ تھا۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ

وہ برف کے گلیشئر سے ٹکرا رہی ہے۔ اُس کا خون منجمد ہو رہا ہے۔ اور پھر اُسے خیال آیا کہ پھر آج ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ وہ آج کیوں اس پُرخطر راستہ کو اختیار کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اگر آج اس نے اپنی ماں کے بڑھتے ہوئے پیٹ کو نہ دیکھ لیا ہوتا۔ تو شاید اسے ایسا شدید دھکا محسوس نہ ہوتا۔ شاید وہ ان باتوں کو نہ سوچتی، شاید چندا خوابوں کی دنیا میں بسی رہتی۔ لیکن ماں کے اس بڑھتے ہوئے پیٹ کو دیکھ کر اُسے محسوس ہؤا کہ اسکی جوانی، امنگیں خواہشیں، لذتیں اسی میں دفن ہیں۔ یہ پیٹ ہر سال بڑھتا اور کم ہوتا رہے گا۔ اور اس کی خوشیوں، لذتوں اور کیفیتوں کو بے لذت بناتا رہے گا۔ اُسے اپنے باپ پر غصّہ آیا۔ اُسے اپنی ماں پر غصّہ آیا۔ جنہیں گھر کی اقتصادی حالت کا رتی بھر خیال نہ تھا۔ اور ہر سال ایک بچّہ کا اضافہ کر دیا کرتے تھے کیا وہ کبھی نہیں سوچتے کہ اتنے بچّے پیدا کر کے، وہ کیا کریں گے اس کے باپ کی اتنی قلیل تنخواہ تھی کہ مشکل سے صرف انکا گزارہ ہو سکتا تھا۔ اور اگر وہ برسرِ روزگار نہ ہوتی تو آج جنگ کے زمانہ میں وہ فاقے کرتے اور کب کے راہیِ ملکِ عدم ہوتے۔ لیکن اس کے والدین نے کبھی نہ سوچا کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور اس کا نتیجہ کیا ہو گا۔ شاید غریب آدمی کم سوچتے ہیں یا انہیں اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ سوچ سکیں۔ دن بھر کے تھکے ماندے جب وہ گھر آتے ہیں تو نیند ان کی پلکوں پر جمی ہوئی ہوتی ہے اور رات کی تاریکی میں جو کچھ وہ کرتے ہیں۔ اُن کا انہیں علم نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ اس کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اگر چندا کو اپنے والدین پر غصّہ آتا تو کچھ

عجب نہ تھا، لیکن آج تو اسے ہر بات پر غصہ آ رہا تھا، اپنے باپ پر، اور اس کے بنانے والے پر زندگی میں ایک چیز تو دی ہوتی، اگر غربت دی تھی تو خوبصورتی کیوں چھین لی اور اگر بنانے والے نے خوبصورتی سے محروم کیا تھا تو رنگ ہی اچھا دیا ہوتا۔ یہ کیا دے دیا۔ بالکل کالا سیاہ رنگ کوئل جیسا کوئل سے اُسے نفرت تھی۔ کیونکہ کوئل کا رنگ سیاہ ہوتا ہے۔ لیکن اُسے کوئل کے نغمہ سے محبت تھی۔ اُسے اپنے چہرے کی رنگت سے نفرت تھی لیکن دل کے نغمہ سے محبت تھی۔ دل جو اکثر بے چین ہو جاتا ہے۔ آم کے بور اور چھوٹے چھوٹے ذرات جن کی خوشبو سے اُس کی جوانی کی امنگیں تازہ ہو جاتی تھیں۔ وہ ابھی تک جوان تھی۔ اُس کی عمر کیا ہو گی یہی بیس برس وہ ابھی تک جوان ہے گو ان چند سالوں میں کمزور اور دبلی ہو گئی تھی۔ لیکن دل کی اُمنگیں جوان ہیں۔ اُسے کسی کے جسم کی لمبان اچھی لگتی ہے اُسے اداس تنہا چاند بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اور جب کبھی چنبیلی اور موتیا کے پھول کھل جاتے ہیں اور املی اور کھٹوں کے پتے ہرے ہرے ہو جاتے ہیں تو اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔ اور پھر اُسکے ذہن نے ماضی کی طرف زقند لگائی اور کسی کی آواز اس کے کانوں میں سنائی دی۔

”بیٹی چندا!“

”پاپا!“

اور اس کا باپ اس کے قریب آ کر کہتا ”بیٹی جب تمہاری شادی کرنے

کو جی چاہے۔ تو فوراً مجھ سے کہہ دینا۔ میں تمہارا بندوبست کر دونگا"

اور پھر چندا کا چہرہ سرخ ہو جاتا، یا یوں کہیئے کہ زیادہ سیاہ ہو جاتا۔ ٹھوڑی سے لے کر ماتھے تک خون لہریں مارنے لگتا۔ آنکھیں جگنو کی طرح چمکنے لگتیں۔ سر سے لے کر پاؤں تک خوشی اور انبساط کی لہریں دوڑ جاتیں اور وہ شرم سے زمین کریدنے لگتی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی لیکن آواز حلق میں اٹک جاتی۔

چندا کے باپ پھکڑو نے کئی بار یہ الفاظ کہے تھے۔ جب وہ چودہ سال کی تھی۔ بالکل سرسوں کے ساگ کے گندل کی طرح ہری ہری اور نیلی نیلی تب بھی پھکڑو نے اُس کے کان میں آکر کہا تھا "بیٹی ماں باپ کی عزت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ جب تمہارا دل کسی پر آئے تو مجھ سے چپکے چپکے کہہ دینا میں فوراً انتظام کر دونگا"

اور چندا سوچتی کہ اس کے باپ کو اس کا کتنا خیال ہے۔ اُس وقت یہ الفاظ کتنے پیارے اور حسین لگتے تھے۔ چندا سمجھتی تھی کہ دنیا کی تمام خوشیاں ان لفظوں میں پنہاں ہیں۔ چندا کے باپ نے اُسے دسویں پاس کرائی اور ٹریننگ میں داخل کرایا اور چند سالوں میں چندا اسکول میں استانی ہو گئی اور ۳۵۔ روپے تنخواہ پانے لگی۔ چندا کو اپنے باپ کی عقلمندی پر بڑا ناز تھا۔ آج بستر پر لیٹے ہوئے چندا کے سامنے ماضی کے تمام واقعات بھر گئے۔ اُسے اچھی طرح یاد ہے کہ اسکے باپ کو اپنی

عزت کا بڑا پاس تھا۔ گو وہ تحصیل میں چپڑاسی کا کام کرتا تھا۔ اور اُسے صرف بارہ روپے تنخواہ ملتی تھی۔ لیکن وہ کسی کی پرواہ نہ کرتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو کسی سے کم نہ سمجھتا تھا۔ وہ اکثر لوگوں سے کہتا کہ وہ مجسٹریٹ کی کچہری میں نوکر ہے، اُس کی بڑی لڑکی اسکول میں اُستانی ہے۔ وہ کیوں کسی سے ڈرے وہ کیوں کسی کی چاپلوسی کرے۔ وہ خود کماتا ہے اور کھاتا ہے وہ جب کبھی چلتا۔ تو اُس کے پاؤں اُچھل اُچھل کر زمین پر پڑتے۔ عیسائی ہونے کے باوجود اُسے عیسائیوں سے نفرت تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ محلہ کا ہر لڑکا اُس کی لڑکی پر آنکھ رکھتا ہے۔ کمینے۔ کمذات لڑکے اُسکی لڑکی کی طرف دیکھتے ہیں۔ وہ کیوں اُس کی لڑکی کی طرف دیکھتے ہیں۔ عزت کا پاس نہیں۔ غیرت نام کو نہیں اور پھر وہ چندا سے کہتا۔ دیکھو تم اُنکے گھر مت جایا کرو۔ مجھے اُن کے لڑکے اچھے نہیں لگتے۔ یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تمہاری طرف دیکھتے ہیں۔ اور وہ لمبا تڑنگا سالڑکا جو اس گھر میں رہتا ہے نا۔ وہ تمہاری طرف ایک عجیب انداز سے دیکھ رہا تھا اور تم اُس کی طرف مسکرا مسکرا کر دیکھ رہی تھیں۔ کیوں ایسا کیوں ہوا؟ اور پھر وہ اپنی چھوٹی چھوٹی چندھیائی ہوئی آنکھیں چندا کے چہرے پر گاڑ دیتا اور اسکے چہرے کے خدوخال کا اس طرح ملاحظہ کرتا۔ جیسے ایک ڈاکٹر خوردبین سے مرے ہوئے جراثیم کو دیکھ رہا ہو۔ اور چندا باپ کی مشکوک نگاہوں کو دیکھ کر گھبرا جاتی۔ اور اُسے باپ کی بناوٹی باتوں پر بہت غصہ آتا۔ وہ اکثر اپنی سہیلی کے گھر جاتی تھی۔ لیکن آج تک کسی نے

اُس کی طرف مسکرا کر نہیں دیکھا۔ ہاں اُس کی سہیلی کے بھائی ہیں خوبصورت اور جوان اور خاص کر وہ لڑکا تو اُسے نہایت ہی اچھا لگتا ہے۔ جو اکثر دالان میں آتا تھا اور اپنی بہن سے اکثر گفتگو کرتا تھا۔ لیکن اُس نے کبھی اُس کی طرف مسکرا کر نہیں دیکھا شاید اُس کی رنگت اتنی سیاہ تھی کہ وہ اُسکی طرف ایک نظر دیکھنا بھی گوارا نہ کرتا تھا، کاش وہ کبھی اُس کی طرف دیکھ کر مسکراتا۔ اور نہ۔ کوئی مسکراتا تو وہ نہ مسکراتی، وہ کیوں نہ مسکراتی اور چنداؔ سوچتی کہ اُسکی زندگی مسکراہٹوں سے خالی رہی ہے۔

آجتک کسی نے اُس کی طرف مسکرا کر نہیں دیکھا اور وہ درزی جو دن رات ہارمونیم بجاتا تھا اور گاتا تھا۔ وہ ہاں یاد آیا۔ ساون کے نظارے ہیں، للا ...... لا ـــــــ للا ـــــــ لا ......

ساون کے نظارے ہیں۔ درزی کی چنداؔ پہ آنکھ تھی اور وہ اکثر اسکا تعاقب بھی کیا کرتا تھا۔ گو اسکا باپ گھر سے لے کر بس کے اڈے تک چھوڑنے آتا تھا۔ اور وہ بس میں سوار ہو کر اسکول چلی جاتی تھی۔ اور شام کو اُس کی ماں بس کے اڈے پر آجاتی تھی۔ لیکن وہ کالا سانولا سا درزی بس میں کبھی نہ آیا۔ شاید وہ چنداؔ کے باپ سے ڈرتا تھا۔ بچارا کمزور تھا نا۔ ایک ٹانگ ہی نہ تھی اور جس کی ایک ٹانگ نہ ہو وہ کس طرح لڑ سکتا ہے۔ یہی بات ہو گی ورنہ وہ ضرور آتا۔ وہ اکثر چنداؔ کے پیچھے متحرک سائے کو دیکھتی تو بھکرو کی آنکھیں انگارہ ہو جاتیں

اور وہ چندا سے کہتا " میں اسکی آنکھیں نکال دوں گا۔ میں اُسکی زبان کھینچ لونگا۔ سالے نے سمجھا کیا ہے۔ محلہ میں دن رات فحش گیت گاتا رہتا ہے۔ بے شرم کہیں کا " اور پھر چندا سے دبی زبان میں کہتا۔ " چندا دیکھو اگر تمہارا کسی پر دل آئے تو چپکے سے مجھ سے کہدینا میں فوراً انتظام کر دوں گا "

اس کے باپ نے کئی بار یہ الفاظ دہرائے تھے، لیکن آج تک ان پہ عمل نہ ہوا تھا اور ان چند سالوں میں چندا نے محسوس کیا کہ ان لفظوں کی سحر انگیزی مٹ چکی ہے۔ اب اس کا دل ان لفظوں کو سنکر دھڑکتا نہیں بلکہ دل کی دھڑکن مدھم ہو جاتی ہے۔ اگر چندا چاہتی تو وہ کسی سے شادی کر لیتی۔ لیکن گھر کی اقتصادی حالت کچھ اسطرح بگڑی ہوئی تھی کہ وہ کچھ عرصہ اور انتظار کرنا چاہتی تھی۔ تاکہ اس کی چھوٹی بہنیں جوان ہو جائیں اور کسی سکول میں نوکر ہو جائیں تب وہ ——— تب وہ ——— کسی سے شادی کر لے گی۔ پھر وہ چندا کی بڑی بہن کو گالیاں دیا کرتا تھا " بے حیا کہیں کی ہم نے اسے پالا پوسا۔ پڑھایا اور نوکری دلائی جب وہ جوان ہوئی "۔

" تو کیا ہوا پاپا "۔ چندا پوچھتی۔

" کیا ہوا۔ وہ گھر سے بھاگ گئی۔ ہماری عزت کو بٹہ لگایا اور پھر اُس کے بعد کبھی نہ آئی۔ یہاں کبھی آئے تو ٹانگیں توڑ دوں "۔ چندا دل میں کہتی

بھاگ گئی۔ اور دُور نیم کے درخت پر بلبل نغمہ سرا تھی۔ آم کے بور۔ ملکے ملکے ذرّات ہوا میں تیرتے ہوئے، سوندھی سوندھی خوشبو ——— اداس چاند ——— گہرے سائے ——— اور متحرک زندگی اور اسکے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی اور وہ دل میں سوچتی کہ اسکی بہن نے بہت دیر انتظار کیا ہوگا۔

"بدمعاش کہیں کی!" بھیکرو چلاتا۔

چندا کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ جاتا اور اپنے پاپا کی تقریر سننے لگتی۔

"ہم کیوں عیسائی بنے، ہم کیا تھے پر بھی جانتی ہو ہم ہندو تھے ہم چمار نہ تھے۔ کھسیارے نہ تھے۔ کیا ہوا پیٹ کی خاطر عیسائی ہو گئے۔ پیٹ کے لئے انسان کیا کچھ نہیں کرتا ہم اُن عیسائیوں کی مانند نہیں ہیں جو جھٹ گرجا میں جاکر نام تبدیل کرا لیتے ہیں مسٹر آر ——— آر ——— لاٹ ٹیدم واٹ ——— میں کہتا ہوں ہم ہندو عیسائی ہیں ہم خاص برہمن تھے۔ ہماری رگ رگ میں ہندو دھرم رچا ہوا ہے ہم شریف خاندان کے رکن ہیں کوئی ہماری بہو بیٹیوں کی طرف دیکھے تو سہی۔ آنکھیں نکال دوں۔ اُن کی اِن عیسائیوں کی طرف تم نے نہیں دیکھا ہر ایک میم بن بیٹھی ہے۔ اُن کی لڑکیاں اکیلی باہر جاتی ہیں اور ——— اور ———"

"دھیرے دھیرے بات کرو، اماں کہتی ہیں ———؟"

"میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ میں عیسائی ہوں، لیکن عیسائیوں سے میں نہیں ڈرتا۔ میں ہندو عیسائی ہوں کوئی چمار نہیں، ہم عزت کے لئے مر سکتے ہیں۔ اور چندا کے باپ کا غصہ ٹھنڈا ہو جاتا۔ اور وہ چندا کے قریب آکر کہتا!"

"چندا بیٹی۔ اگر تمہارا کسی پہ دل آئے تو چپکے سے کہہ دینا۔ میں فوراً شادی کر دوں گا!"

دل آئے! چندا بڑبڑاتی جیسے اُس کا جی نہیں چاہتا کہ وہ شادی کرے اُس کا دل کب اور کس پر آئے گا۔ اس کے متعلق اُسے کچھ معلوم نہ تھا۔ ممکن ہو سکتا ہے کہ کسی پہ نہ آئے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ اُس لنگڑے درزی پر ہی آجائے۔ لیکن اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ اس فرسودہ زندگی میں ایک نئی جان پیدا کر دے۔ یہ گھٹ گھٹ کر مر جانا اچھا نہیں۔ وہ دن رات والدین کی کڑی نگاہوں میں مقید رہتی ہے۔ اُسے اجازت نہیں کہ وہ کسی سے ہنس کر اپنی روح کی گرانباری کو ہلکا کر سکے۔ آخر وہ بھی انسان ہے اور خوش رہنا چاہتی ہے۔ اگر اس کے ماں باپ کو خوش رہنے کا حق حاصل ہے تو اُسے بھی حق حاصل ہے کہ وہ زندگی کی مسرتوں سے ہمکنار ہو سکے۔ اس کے باپ نے پہلی بیوی کے مرنے کے بعد دوسری شادی کر لی تھی پہلی بیوی سے تین لڑکیاں تھیں۔ اور دوسری بیوی ہر سال ایک بچہ جنتی تھی۔ کیا اس کے باپ نے یہ کبھی نہ سوچا کہ وہ اتنے بچے پیدا کر کے کیا کرے گا۔ اُن کی کس طرح

پرورش کرے گا۔ کاش اس کا صرف ایک ہی بھائی ہوتا۔ یا صرف ایک بہن۔ وہ اُسے پڑھاتی اور جب وہ جوان ہو جاتی تو اُس کی شادی کر دیتی لیکن یہاں تو بات ہی اور تھی۔ اتنے بچوں کا پالنا پوسنا اور پڑھانا اور شادی کرنا ان باتوں کے لئے عمر درکار تھی۔ اور آج بستر پر لیٹے لیٹے اس کے دماغ میں بغاوت کے خیالات سما گئے اور وہ سوچنے لگی کہ وہ اس دنیا میں کیوں پیدا ہوئی۔ کیا اسی کا کام دن رات روزی کمانا ہی ہے، اور پھر زندگی کے ان گنت جھمیلوں میں ہمیشہ کے لئے سڑتی رہے اس سے بہتر تو یہ ہے کہ وہ اس گھر سے چلی جائے اور دُور کسی شہر میں جہاں اس کا باپ نہ ہو ماں نہ ہو اور نوکری کر لے۔ اور پھر وہ خوشی کے چند لمحات خرید سکے گی پھر اسے خیال آتا کہ اگر وہ گھر سے چلی گئی تو اس کی بہنوں کا کیا ہو گا۔ اس کے بھائیوں کا کیا بنے گا۔ فرض کی عالمگیر چٹان کو دیکھ کر اُس کا دل گھبرا جاتا اور وہ سوچتی کہ اس کا فرض اس کی جائز خوشی پر حاوی ہو رہا ہے کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے فرض کو بھول جائے۔ آخر وہ کیوں ان بہن بھائیوں کی پرورش کرے۔ یہ اُس کا قصور نہیں ہے، کاش وہ اکیلی ہوتی۔ لیکن وہ آج اپنے باپ سے صاف لفظوں میں کہہ دے گی۔ کہ وہ آج سے آزاد ہے۔ اُس کا جسم آزاد ہے۔ اُس کی روح آزاد ہے۔ اُسے کوئی قید نہیں کر سکتا اُسے نعمتیں اچھی نہیں لگتیں وہ اِن جھوٹی اخلاقی مسرتوں کو نہیں مانے گی وہ اپنے شباب کو یوں

غمازی نہیں کرے گی۔ وہ سوچتے سوچتے باہر آ گئی۔ ان خیالات کے بوجھ سے اُس کے جسم میں ایک حدّت سی آ گئی تھی۔ سر سے لے کر پاؤں تک خون کی روانی تیز ہو چکی تھی۔ اس کے لب ایک غیر واضح جذبہ سے کانپ رہے تھے اس کی گھنی گھنی پلکیں اس کے کالے کالے گالوں پر جھکی ہوئی تھیں اس نے اپنے خیالات کو سرپٹ دوڑایا تھا۔ اس لئے وہ ایک لذت آمیز تھکن سی محسوس کر رہی تھی۔ اگر چاند کی ٹھنڈی کرنوں نے اُسے آغوش میں نہ لے لیا ہوتا تو شاید وہ بے ہوش ہو جاتی۔ دھیرے دھیرے وہ چاند کی سیمیں کرنوں میں نہانے لگی ہر طرف چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے گھر پر سامنے باغ پر۔ دور لال کوٹھی پر، آم کے درختوں پر، گرجا کے برج پر، دھوبیوں کی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں پر، وہ چپ چاپ کھڑی رہی اور نیم کے درختوں پر خاموشی برستی رہی۔ چاندنی پھیلتی رہی۔ نیم کے درخت چپ چاپ استادہ تھے اور چاند کی کرنیں نیم کے پتوں کو چوم رہی تھیں۔ وہ ہری ہری گھاس پر لیٹ گئی۔ گھاس نرم اور ملائم تھی۔ گھاس پر لیٹے ہوئے اُسے ایک جنسی آسودگی سی محسوس ہونے لگی۔ اس کا منہ گھاس سے ہم آغوش تھا۔ زمین کی سوندھی سوندھی خوشبو اس کے نتھنوں میں سمانے لگی اور اس نے اپنا چہرہ گھاس میں چھپا لیا اور اُسے بار بار چومنے لگی چومتے چومتے اُس کے جسم میں ایک نیم اضطراری لہر دوڑ گئی ہر طرف خاموشی تھی صرف

چاندنی برس رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وقت کی رفتار تھم چکی ہے۔ اور حرکت خاموشی میں مدغم ہو چکی ہے۔ صرف اس کے خیالات جاگ رہے تھے۔ اور دور آسمان پر چاند اکیلا زندگی کی گردش کو پورا کر رہا تھا۔ کتنی گہری خاموشی تھی اُس کے عضو عضو میں سما رہی تھی۔ خاموشی یا آگ لیکن وہ خود اس آگ کا حصّہ تھی۔ اُس کے جسم میں آگ مشتعل تھی۔ وہ اس آگ کی موسیقیت میں ہمیشہ کے لئے اپنے آپ کو غرق کرنا چاہتی تھی۔ تاکہ معلوم نہ ہو کہ آگ کہاں سے شروع ہوئی اور کہاں ختم ہوئی۔ اُس رات اُس نے محسوس کیا وہ پہلی سی عورت نہیں ہے۔ وہ ایک مختلف عورت ہے۔ بلکہ وُہ عورت ہی نہیں۔ وہ کچھ اور ہے وہ صرف آگ کا شعلہ ہے لیکن وہ آج ننگی تھی بالکل ننگی وہ کچھ شرم محسوس کرنے لگی اور آہستہ آہستہ ریشمی گھاس پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ اسکا دل دھڑک رہا تھا۔ اسکا گرم سانس ٹھنڈے ہونٹوں سے ٹکرا رہا تھا۔ دُور درخت پر اُلّو چلّایا۔ اور چاندنی ٹھرا کر رہ گئی یکایک اس نے سوچا کہ یہ خاموشی کسی آنے والے طوفان کی پرتو ہے طوفان جو اسکے دل کے اندر بند ہے اور جب صبح ہو گی اور روشنی کا جنم پھوٹ نکلے گا تو اس طوفان کو کوئی نہ روک سکے گا اور یکبارگی اُسے محسوس ہوا کہ برآمدے میں سوئے ہوئے والدین اس بات سے ناآشنا تھے۔ کہ اُنکی دوسری لڑکی نے بھی عزم آخری کر لیا ہے۔

حنائی انگلیاں

کیا کرتے ہو راجندر بھیا؟ کچھ نہیں، بی اے پاس کر چکا ہوں۔
اب کیا کر رہے ہو۔ ایم۔ اے کی تیاری کر رہا ہوں۔ اور ——
پھر کیا کروگے۔ بی۔ اے کا امتحان پھر دوں گا۔ آہا۔ آہا۔ ہا ہا۔ ہا۔

سالی نوکری نہیں ملتی، بہت کوشش کر چکا ہوں، جھوٹ بکتے ہو، دن رات گھر میں رہتے ہو، اور اپنے ماں باپ کا خزانہ خالی کر رہے ہو، اور پھر کہتے ہو، بہت کوشش کر چکا ہوں، تم کیا کوشش کروگے، تم میں کام کرنے کی صلاحیت ہی نہیں، تم کام کر ہی نہیں سکتے، جو کام کرنا چاہتے ہیں، وہ کام سے آتے ہیں، تم —— تم

کاٹھ کے اُلّو ہو، تم کیا کروگے، بوٹ پالش کرو۔ بوٹ ــــــ سُنا
تم نے ــــــ کیا کبھی کسی سے ملنے گئے، کسی کی سفارش حاصل کرنے
کے لئے ہاتھ پاؤں مارے ــــــ کسی کی جوتیاں چٹخائیں، کسی کے
لڑکے کو مفت پڑھایا۔ کسی کی چاپلوسی کی، کسی کی تعریف میں قصیدے
پڑھے، اور پھر کہتے ہو، بہت کوشش کر چکا ہوں، جاہل۔ بیوقوف
ــــــ کیا نوکری اس طرح ملا کرتی ہے، آجکل کے لڑکے کام تو
کرتے نہیں، وہ تو چاہتے ہیں، کہ بیٹھے بٹھائے کوئی کام مل جائے۔
ہزاروں روپوں کی تھیلی ہاتھ میں آجائے، اور پھر وہ گلچھرے اڑائیں،
ناک سے دھواں نکالیں، سینما دیکھیں، اور نسبت روڈ پر لڑکیوں سے
دل لگی کریں۔ بدمعاش۔ شہدے کہیں کے۔

میری طرف نہیں دیکھتے۔ سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہوں، جسم ہڈیوں
کا ڈھانچا بن گیا ہے، یہ کس طرح ہوا۔ کیونکہ ہوا۔ تمہاری طرح ہی
تھا، موٹا ــــــ تازہ ــــــ آنکھوں میں چمک تھی، جسم گوشت
سے بھرا ہوا تھا، چہرے پر دلا آویزی تھی ــــــ کر مرگئی ــــــ
کیا کیا ــــــ جونک پی گئی ــــــ کہا نہ تھا۔ محنت کرو، خوب دل
لگا کر پڑھو۔ ایم۔ اے میں سیکنڈ ڈویژن لو۔ تم کیا جانو۔ نوکری
کس طرح ملتی ہے۔ جاؤ۔ ڈنڈ پیلو۔ اکھاڑے میں جاؤ، مالش کرو۔ آئے
پڑھنے۔ اور پھر کہتے ہو۔ نوکری نہیں ملتی۔

کام کرنے سے نوکری ملتی ہے۔ میاں۔ پرویز گھونش کی طرف

آنکھیں اندر دھنس چکی ہیں، چھاتی دکھتی ہے۔ پھیپھڑوں سے خون آتا ہے گورنمنٹ نے انہیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی ہے، اور ایک ہزار روپے ماہوار تنخواہ دے گی۔۔ سولن جا رہے ہیں، ایسے نوکری ملتی ہے۔

تمہیں تپ دق چاہیئے۔ یا نوکری۔ آہا۔ آہا۔ اوہ۔ ہو۔ تپ دق جاؤ۔ سولن وارڈ میں رہو۔ اور لوگوں سے پوچھو۔ کہ انہیں کیوں تپ دق ہو گیا۔ وٹامن کھانے کو نہیں ملتا، دودھ پینے کو نہیں ملتا، اور صاف ہوا سانس لینے کو نہیں ملتی، نوکر ہو کر کیا کرو گے۔ شادی کرو گے۔ کیا تمہیں دنیا میں اور کوئی کام نہیں۔ نوکری کے بعد شادی۔ عورت —— عورتیں تو بازار میں پھرتی ہیں، کسی ایک کو پکڑ لو۔ ارے جوتیوں سے ڈرتے ہو، جوتیوں سے یا عورت سے میرے اللہ۔ غلام بھی کوئی نہ ہو۔ عورت سے ڈرتے ہو۔ غلام کہیں کے۔ آزادی نہیں ملتی، ملے کیوں کر۔ اچھا آؤ۔ ایک اور راستہ دکھاؤں، جاؤ۔ اُس بازار میں، جہاں عورتیں بکتی ہیں، سمجھ گئے۔ میں بھی کئی بار گیا ہوں، جب تک شادی نہیں کی تھی، ہر روز جاتا تھا، ارے۔ کیا کہا۔ سوزاک —— سوزاک سے ڈرتے ہو۔ دہلی کا دوا خانہ موجود ہے۔ کوی شاہد اس موجود ہے۔ پاگل خود میرے پاس ایک مجرب نسخہ ہے" ایک دن میں پیپ جلن بند"، ایک بار مجھے بھی ہوا تھا سنا تم نے۔ سوزاک نہیں آتشک۔ کچھ بھی نہیں ہوتا —— خون

خراب ہو جاتا ہے۔ جسم پر پھوڑے نکل آتے ہیں اور پھر ——————
پھر —— علاج نہ کراؤ۔ تو مکتی مل جاتی ہے۔ کتنا سہل طریقہ ہے مکتی
حاصل کرنے کا۔ عورت کے ذریعے مکتی۔

کیا کہا۔ کوڑھ ہو جائے گا۔ کوڑھ سے ڈرتے ہو۔ ارے میاں۔
تم بہت ڈرپوک ہو۔ ہر روز جذامیوں کو راستے میں لیٹے ہوئے دیکھتے
ہو۔ اور پھر بھی ان سے ڈرتے ہو۔ میں سمجھ گیا۔ تم عورت سے ڈرتے
ہو۔ تم نروان حاصل نہیں کرنا چاہتے۔ میں —— میں —— چھ
بچوں کا باپ ہوں۔ دو بچوں کو میں نے آتشک دیا ہے۔ ایک کی
آنکھیں اندھی ہو گئی ہیں، اور دوسرے کی ٹانگیں ٹیڑھی ہو گئی
ہیں، اور میری بیوی کو بھی آتشک ہو گیا ہے۔ لائل پور سے گیا تھا،
لیڈی ڈاکٹر کہنے لگی۔

"تم اچھی لڑکی ہو۔ تمارا کوئی کسور نہیں، سارا تمہارے خاوند کا
قصور ہے۔ وہ بدمعاش ہے۔ تم مت رو۔ اچھا ہو جائے گا"! خدا
غارت کرے اس لیڈی ڈاکٹر کو۔ اسے میری بیوی کو اچھا کر دیا۔
کیوں —— مجھے اپنی بیوی سے نفرت ہے۔ کتنی بدصورت ہے
میں ایک آرٹسٹ ہوں، مجھے خوبصورتی پسند ہے۔ خوبصورت عورتیں
گول گول مکھن کی طرح سپید بازو۔ دلکش نکھری ہوئی رنگت۔ آنکھیں
جیسے۔ کیا کہا۔ کوئلے کی طرح ——————

کیا کہا۔ مر گئی ——— نہیں۔ نہیں۔ میری بیوی زندہ ہے۔ اور میں بھی زندہ ہوں، لیکن پھر بھی اُس بازار میں جاتا ہوں۔ جہاں عورتیں بکتی ہیں اجناس کی طرح، تم تو کہتے تھے، کہ جانا بند کر دیا۔ جھوٹ بکتا تھا۔ مجھے حسن چاہیئے، خوبصورت عورتوں کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔

کیا کہا ——— آس پاس کے گلی کوچوں میں، ارے بھئی! نہیں شریف آدمی پھانس سکتے ہیں، میں رات کے اندھیرے میں جاتا ہوں۔ کون کہتا ہے۔ میں دن کو جاتا ہوں، لوگ رات کو جاتے ہیں، میں ایک اچھے عہدے پر فائز ہوں۔ کیا کہا۔ رات کو جاؤں، ہاں سمجھ گیا۔ تمہاری چالاکی، دفتر سے نکلوانا چاہتے ہو۔ اور میری جگہ حاصل کرنا چاہتے ہو، کبھی نہیں، میں دن کو جاؤں گا۔ رات کو بدمعاش جاتے ہیں، میں شریف ہوں، میں نے شادی کی ہوئی ہے۔ میرے بال بچے ہیں میں دن کو جاتا ہوں۔ ....

اوہ ——— تم نے مس شمی نہیں دیکھی، خدا کی قسم ——— نری مورت ہے، سونے کی مورت، تم کیا جانو۔ اُس میں کتنی کشش ہے۔ اُس کی گول گول باہوں میں کتنی لطافت ہے اُن سپید سپید ——— مرمریں ہاتھوں میں کتنا سکون ہے۔ اور پھر مس جلو ——— اُف اُس کی آنکھیں تیر کی طرح کلیجہ میں پیوست ہو جاتی

ہیں۔ اور ہاں یاد آیا، مس بانو۔ خدا اُس کی عمر لمبی کرے۔ ارے دیکھو۔ بوٹ پوٹ ہو جاؤ، اُسے مجھ سے کتنی محبت ہے۔ بے انداز محبت ——— ایک دن میں اُس کے کوٹھے پر ایک ہفتہ کے بعد گیا۔ کہنے لگی۔ میں تجھ سے محبت کرتی ہوں۔ حرامزادے۔ تو ——— تو دوسری رنڈیوں کے پاس جاتا ہے۔ بتاؤ۔ مجھ میں کیا کمی ہے۔ کیا تو مجھے حیوان سمجھتے ہو۔ کیا میں محبت نہیں کر سکتی۔ کیا میں جذبات سے مبرّا ہوں، کیا میں محسوس نہیں کر سکتی۔ حرامی۔ گدھے، میں کتنے عرصہ سے تیرے فراق میں گھل رہی ہوں، آج چڑھا ہے میرے ہاتھ ——— میں تمہیں خوب پیٹوں گی ——— کیوں جاتے ہو کسی کے گھر۔ بولو۔ کہو۔ نہیں۔ نہیں معاف کر دو۔ اب کبھی نہ جاؤں گا۔ اب کہیں نہ جاؤں گا۔ اب معاف کر دو۔ لیکن اُس نے میرا بوٹ چھپا لیا۔ اور کہنے لگی "جاؤ ——— مردود ——— بے حیا ——— دوسری رنڈیوں کے پاس جاتا ہے!" میں نے اُس کے پاؤں پکڑ لئے، خدارا ——— کیوں دفتر سے نکلواتی ہو۔ کہاں جاؤں ننگے پاؤں۔ ننگے سر۔ کسی نے دیکھ لیا۔ تو ——— تو کہہ دینا۔ کہ پاگل ہو گیا ہوں، حیوان ہوں۔ کیا کہا۔ میں پاگل ہوں۔ کیا میں پاگل ہوں۔ میں بالکل پاگل نہیں۔ ہیجڑا ہوں۔ ہیجڑا۔ نہیں ——— نہیں ——— نہیں۔ میرے چھ بچے ہیں۔ مجھے کون ہیجڑا کہتا ہے ——— میں۔ چھ بچوں کا باپ ہوں۔

اوہ میں بھول گیا۔ تم بھی چلو گے۔ ائے بھئی۔ ایک اور پرانی واقف
کار آئی ہے۔ بالکل نئی۔ راولپنڈی سے آئی ہے۔ دیکھو۔ تو تڑپ اٹھو۔
کانوں میں چمکتے ہوئے آویزے۔ باہوں میں سبز رنگ کی چوڑیاں اور
بدن پر سرسراتی ہوئی آسمانی رنگ کی ساڑھی۔ کاش تم اُسے دیکھ سکو۔
اوہ تم بازار جانے سے ڈرتے ہو۔ کتنے ڈرپوک ہو تم۔ تم ہر بات سے
ڈرتے ہو۔ تم ہر ایک سے ڈرتے ہو۔ عورتوں سے۔ مردوں سے، بڑے
آدمیوں سے، بچوں سے۔ اور اپنے آپ سے بھی۔ چلو میرے ساتھ۔ اس
نے ایک محلہ میں جگہ لی ہوئی ہے۔ میں ہر روز وہاں جاتا ہوں۔ کوئی پوچھتا
ہے۔ تو کہتا ہوں۔ میرے رشتہ دار کا گھر ہے۔ میرے ماموں کی لڑکی
رہتی ہے۔ میری سالی رہتی ہے۔ ہنس رہے ہو۔ کیا کہا۔ روپیہ نہیں
پاگل چوری کرو۔ ڈاکہ ڈالو۔ پولیس سے ڈرتے ہو۔ ارے ارے۔
ہر آدمی سے ڈرتے ہو۔ تم تو خوف سے بھی خوف کھاتے ہو۔ کیا کہا بیماری
——— بیماری سے ڈرتے ہو۔ ڈاکٹروں سے ڈرتے ہو۔ اُٹھو۔
چلو بھی، کتنے عرصہ سے تمہارے ہاں بیٹھا ہوا ہوں۔ کچھ تو خیال کرو۔
دنیا دیکھ لو۔ میاں۔ ائے۔ ارے یہ کیا۔ رو رہے ہو۔ بیماری
——— بیماری۔ اتنا بھی کیا ڈر۔ دیکھو میں بھی ہوں۔ بالکل تندرست
ہوں۔ صحت مند ہوں۔ کیا ہوا۔ کہ جسم پر گوشت نہیں۔ کیا ہوا۔ کہ
ایک قلم کی طرح دبلا پتلا ہوں۔ دیکھو۔ سانس برابر آ جا رہا ہے۔ ہر روز
روٹی کھاتا ہوں۔ اور تم کیا کرتے ہو۔ دن رات گھر پر پڑے رہتے ہو۔

مکھیاں مارتے ہو۔ ہوش کی دوا کرو۔ راجندر بھائی۔

گھر گھر ـــــ میاؤں۔ میاؤں۔ کون بول رہا ہے۔ اختر بھائی۔
بلیاں۔ بلیاں ـــــ ارے چوہے کہاں ہیں، ارے چوہے کہاں ہیں
اوہ۔ تم یہ بھی نہیں دیکھتے۔ تمہارے سامنے۔ تمہارے آگے۔ تمہارے
دائیں بائیں۔ اوپر نیچے۔ ہر روز دیکھتے ہو۔ گلیوں میں بازاروں میں
ارے ۳۵۰ لاکھ چوہے ہیں ـــــ آہا ـــــ آہا ـــــ آہا ـــــ
ہی ـــــ ہی ـــــ ہی ـــــ ۳۵۰ لاکھ چوہے۔ ارے بلیاں کدھر گئیں،
وہ دیکھو سامنے، میں آنکھیں بند کئے لیتا ہوں۔ کہاں ہیں۔ دکھائی نہیں
دیتیں، ارے بلیاں کہاں ہیں، دکھائی نہیں دیتیں کھا جائیں گی۔
کھانے دو۔ میں آنکھیں بند کئے دیتا ہوں۔ مجھے کوئی نہیں کھا سکتا۔ ۳۵۰
لاکھ چوہے۔ آہا۔ آہا۔ ہی۔ ہی۔ ہی۔

کیا کہا۔ کیا کہا۔ اختر بھائی۔ ہاں۔ تم ٹھیک کہتے ہو، میں ادیب
ہوں، نہایت حساس واقع ہوا ہوں، لوگوں کو دیکھ کر مجھے رونا آتا ہے
تمہاری صورت دیکھ کر بھی۔ ارے تمہیں کیا ہو گیا۔ آج کچھ نہیں کھایا
کچھ تو کھا لو۔ پانی پی لو۔ اختر بھائی۔ ٹھنڈا پانی۔ ہندو پانی۔ مسلم پانی
کونسا پانی پیو گے۔ پانی پی لو۔ اختر۔ سن ـــــ ڈوک نہیں ہو گا۔ لو
نہیں لگتی۔

ہاں - میں ادیب ہوں - کہانیاں لکھتا ہوں، شعر کہتا ہوں،، ارے
دیکھتے نہیں مزدوروں کی حالت، کتنے مضمحل اور افسردہ نظر آتے ہیں - چہرے
پر رنگت نہیں - لب مسکراہٹ سے عاری اور کیا کہا - زندگی بے کیف
بے مزا - ہر وقت کا رونا -

کہانیاں لکھتا ہوں - میں ترقی پسند ادیب ہوں - مزدوروں پر
شعر کہتا ہوں، لوگ سنتے ہیں تو سر دھنتے ہیں - واہ بھئی واہ - خوب
لکھا - مزدور کا کلیجہ نکال دیا - اب بھیجا باہر نکالو - کیا کہا - کیا ملتا ہے،
ارے مزدوروں کو کیا ملتا ہے، کہ ان پر لکھنے والوں کو کچھ ملے، مزدور
بھی فاقے کرتے ہیں - اور ہم لکھنے والے بھی - ترقی پسند ——
ارے نام ہوتا ہے - عوام میں مشہور ہو گیا ہوں، یہ کون جا رہا ہے -
ترقی پسند ادیب —— ارے اس کی حالت - چہرے کی رنگت زرد
—— گال اندر کو پچکے ہوئے - گردن سوکھی ہوئی - چال ڈھال میں
مردنی، آنکھوں میں دہشت - اندھا کیا جانے بسنت کی بہار ——
میں مزدور بننا چاہتا ہوں، میں ایک نئے ادب کی تخلیق کرنا چاہتا
ہوں، جب تک میں مزدور نہ بن جاؤں، جب تک میں ان کی طرح
زندگی بسر نہ کروں، ان کے احساسات - ان کی امنگوں، ان کی
زندگی کی ترجمانی کس طرح کر سکتا ہوں، میں مزدور بن رہا ہوں ہر
روز —— دن بدن —— کیا کہا - تپ دق ہو جائیگا - ہونے
دو - مجھے پروا نہیں، میرا نام روشن ہو جائے گا - مزدوروں کا ترجمان

اُن کا واحد نمائندہ۔ آج مزدور اکٹھے ہوں گے۔ کہاں —— موچی دروازے کے باہر۔ دنیا کے مزدور اکٹھے ہوں گے۔ دنیا کے مزدور اکٹھے ہو جاؤ۔ تمہارے لئے کچھ نہیں بنے گا۔ صرف زنجیریں بنیں گی۔ کیا کہا۔ دنیا کے مزدور اکٹھے ہوں گے۔ موچی دروازے کے باہر —— ارے کون بھونک رہا ہے، کُتّا —— نہیں —— نہیں اُلّو —— —— ارے اُلّو تو رات کو بولتے ہیں۔ یہ کلجگ ہے۔ آجکل دن کو اُلّو بولتے ہیں۔

ہاں ٹھیک ہے۔ کلجگ ہے۔ مجھے اپنی بیوی پسند ہے۔ اور تمہیں اختر بھائی۔ اوہ۔ تم نے تو شادی بھی نہیں کی۔ کیا کہا۔ میری بیوی بدصورت ہے۔ تو کیا ہوا۔ مجھے اُس کی انگلیاں پسند ہیں۔ تم نے اُس کی انگلیاں نہیں دیکھیں، وہ ہر روز پالش کرتی ہے۔ بوٹ پالش نہیں، ناخنوں کی پالش۔ ارے ہر روز۔ حنائی انگلیاں۔ خوبصورت دل کو لبھانے والی، اور پالش کے بعد ایسی معلوم ہوتی ہیں۔ جیسے سونے کی قاشیں، ارے سونے کی قاشیں تو ٹھنڈی ہوتی ہیں، اِن میں خون کھولتا ہے۔ نرم اور گرم ہاتھ۔ مخروطی انگلیاں۔ چغتائی کا شاہکار۔ کیا کہا۔ کام کون کرتا ہے۔ میری بیوی۔ توبہ۔ توبہ۔ میری بیوی کیوں کام کرے، ارے نوکر۔ اُتنی ہمت نہیں۔ کہ نوکر رکھ سکوں ٹھیک کہا۔ تم بہت سیانے ہو۔ کالے کوے کی طرح۔ میرے دل کی

بات جان لیتے ہو۔ اُس کی ایک ساس ہے۔ وہ کام کرتی ہے۔ دن اور رات، میاں تمہاری کیا لگی۔ کیا کہا۔ میری کیا لگی۔ میری بیوی کی ساس۔ میری کیا لگی۔ ٹھہرو۔ سوچ کر بتاتا ہوں۔ ہاں یاد آیا۔ میری کچھ بھی نہیں۔ ارے میری بیوی کی ساس میری کیا لگی۔ دن رات وہ کرتی ہے۔ بہت اچھا کام کرتی ہے۔ دن رات برتن صاف کرتی ہے فرش دھوتی ہے۔ جھاڑو دیتی ہے۔ روٹی پکاتی ہے۔ گھر کا سارا کام میری بیوی کی ساس کے سپرد ہے۔ ایک دن بوڑھیا کہنے لگی۔ تمہاری بیوی کام نہیں کرتی، میں نے ہنس کر ٹال دیا۔ خوب کہا۔ ایسا ہی کرنا چاہیئے کہتی ہے۔ میری بیوی کام نہیں کرتی۔ برتن صاف نہیں کرتی کھوسٹ بڑھیا نہیں جانتی۔ کہ اگر حنائی انگلیاں برتن صاف کرتے کرتے خراب ہو جائیں، تو بتاؤ۔ بتاؤ۔ میری بیوی کی حنائی انگلیاں بدنما ہو جائیں تو اُس کا کون ذمے دار ہوگا۔ میں کس کے سہارے زندہ رہ سکتا ہوں کیا کہا۔ سارا کام بوڑھیا سے لیتا ہوں، کیا وہ انسان نہیں، ارے انسان وہ بوڑھیا۔ ۶۰ سال کی بوڑھیا۔ چلنے پھرنے سے عاری ہاتھ کانپتے ہوئے، کہتی ہے، منہ سے پیپ آتی ہے۔ دانت ہلتے ہیں مسوڑھے خراب ہو چکے ہیں، ڈاکٹر کو بلا لاؤ، دانت نکلوا دو سائے میاں۔ جہاں خون ہوتا ہے۔ وہاں سے پیپ بھی آ سکتی ہے۔ اور ۶۰ سال کی عمر میں پیپ نہ آئے۔ تو اور کیا آئے۔ شہد نکلے گا کیا۔ کہتی ہے مروں گی نہیں۔ تمہارا کام کروں گی۔ برتن صاف کروں گی، سو سال تک زندہ ہوں گی

مرنے میں نہیں آتی ۔ اتنا کام دیا ہوا ہے ۔ پھر بھی مرنے میں نہیں آتی
کتنی سخت جان ہے ۔ مجھے اپنی بیوی کی انگلیاں پسند ہیں، نہایت
خوبصورت اور حسین ۔ ریشم کے تاروں سے زیادہ ملائم ۔ بھلا وہ کیوں
برتن صاف کرے ، انگلیاں بدنما ہو جائیں، تو میں کیا کروں گا۔
اختر بھائی ۔ تم مجھے کوستے ہو ۔ بتاؤ ۔ میں کس کے سہارے جی سکتا
ہوں، یہی تو میرا زندگی کا سرمایہ ہے ۔ اگر یہ مٹ جائے ۔ تو پھر
——— میں ادیب ہوں، نہایت حساس ہوں ، بڑھیا کام کرے
اور خوب کرے ۔ .... اور وہ حنائی انگلیاں ......

کیا کہا ۔ ارے بولو ۔ بھئی ۔ میرے کان تو بہرے نہیں، گو دماغ
میں بھوسہ بھرا ہوا ہے ۔ کہیں کان تو بہرے نہیں ، اختر میاں ۔ تم کیا
جانو ۔ شادی کے مزے ۔ میں ان حنائی انگلیوں کو خراب نہیں
ہونے دوں گا ۔

کہتی ہے ۔ میرا خیال کرو ۔ کیا کہا ۔ کون ۔ ارے وہی ۔ میری بیوی
کی ساس ۔ کہتی ہے ۔ میں نے تمہیں جایا ۔ پالا ۔ پوسا ۔ پڑھایا ۔ مجھ
پر احسان جتاتی ہے ۔ شرم نہیں آتی ۔ اختر میاں ۔ میں نے کبھی احسان
جتایا ۔ میں جس پر احسان کرتا ہوں ...... جو احسان کرکے جتانے
لگے ...... تمہیں دو سال سے پڑھا رہا ہوں ، تم ہی بتاؤ ۔ کبھی
تمہیں کچھ کہا ۔ کہو ۔ بولو ۔ کہتے کیوں نہیں ، چپ کیوں ہو گئے ۔ زبان
کیوں گنگ ہو گئی ۔ بولتے کیوں نہیں ۔

ارے کون بھونک رہا ہے۔ بازاری کُتّے۔ گولی سے اُڑا دو۔ پر کُتّے آدمیوں کو کاٹتے ہیں۔ کتّوں کو کسولی بھیج دو۔ کیا کہا ــــــ اُونچی آواز میں کہو۔ میں ہوں۔ اور تو کوئی نہیں۔ میرے باپ کے متعلق پوچھتے ہو۔ اُس کی نظر کمزور ہو گئی ہے۔ وہ عینک مانگتا ہے۔ کتنی عمر ہے اُس کی۔ ۶۵ سال۔ بی۔ بی۔ بی۔ ۶۵ سال کا بوڑھا عینک مانگتا ہے۔ کایا کلپ چاہتا ہے۔ بوڑھے نوجوانوں سے دو قدم بڑھ گئے۔ پھر کہو ــــــ آواز نہیں آتی۔ باز کی آنکھیں لا دوں۔ عقاب کی آنکھیں، خوب کہا۔ اختر ــــــ میری بیوی کو دیکھنا چاہتا ہے۔ عقاب کی آنکھیں، عینک چاہتا ہے۔ بینائی چاہتا ہے۔ عینک پر پندرہ روپے لگتے ہیں، قبر میں پیر لٹکے ہوئے ہیں، پھر بھی بینائی چاہتا ہے۔ کہاں سے لا دوں، ہاں کایا کلپ۔ پنڈت مالویہ ــــــ روپے کہاں ہیں، پندرہ روپے نہیں ملتے، ہاں ٹھیک کہتے ہو۔ پندرہ روپوں سے پندرہ فلمیں دیکھ سکتا ہوں۔ پندرہ عورتیں۔ خوبصورت رسیلے ہونٹ، نشیلی آنکھیں، ابھرا ہوا سینہ، بوڑھا کھوسٹ عینک مانگتا ہے۔ ۶۵ سال کے بعد، آہا ــــــ آہا ــــــ بی بی۔ بی۔

پھٹ۔ پھٹ۔ پھٹ۔ دھم ــــــ دھم ــــــ دھم ــــــ کون آیا۔ بم گرا۔

کہاں۔ لندن ہیں۔ لیکن آواز یہاں آرہی ہے۔ کانوں میں انگلیاں ڈال لو۔ حنائی انگلیاں سونے کی قاشیں۔

آزادی۔ لارڈ ایمری کا بیان۔ انڈیا فسٹ۔ کیا کہا

خوب کہا۔ کون تقریر کر رہا ہے۔ چرچل "ہم آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں، ہم غلامی کو اس دنیا سے مٹا دینا چاہتے ہیں، ہم فرانس کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتے ہیں، ہم لڑیں گے ہر جگہ، زمین پر، خشکی پر، سمندر پر۔ آسمان پر۔ اپنی زمین پر۔ کینیڈا میں۔ آسٹریلیا میں۔ ہم سب کو آزاد کرنا چاہتے ہیں، نہیں ——— نہیں ——— میں بھول گیا۔ ہم یورپ کو ہٹلر کے پنجہ سے چھڑانا چاہتے ہیں۔ کیا یورپ میں ہندوستان بھی شامل ہے ...."

خوب زور سے تالیاں پیٹو۔ اختر میاں۔ آزادی مانگتے ہو ——— آزادی مانگنے سے نہیں ملتی، اور کچھ مانگو، کیا کہا ——— موت ——— ابھی لو ——— اسی وقت لو ——— چلاؤ ——— خوب زور سے چلاؤ۔ ہاں کہو مسجد مندر بن گئی۔ مسجد مندر بن گئی وہ دیکھو سامنے۔ بازار بند ہونے لگے۔ بنئے گھروں میں گھس گئے۔ لاٹھیاں چلنے لگیں۔ پتھر برسنے لگے۔ ہائے میرا لال۔ کسی ہندو نے گولی سے مار دیا، ہائے میرا بچہ ——— کسی مسلمان نے چھرا گھونپ دیا ——— دیکھا ——— دیکھتے نہیں، خون کی ندیاں۔ کہاں ——— وہ دیکھو ——— مندر

مسجد بن گیا ـــــ انڈیا فسٹ، مت چلاؤ ـــــ آزادی ـــــ
ـــــ ہٹلر کے بعد، اور موت ابھی لو ـــــ اسی وقت ـــــ
ـــــ جب جی چاہے ۔
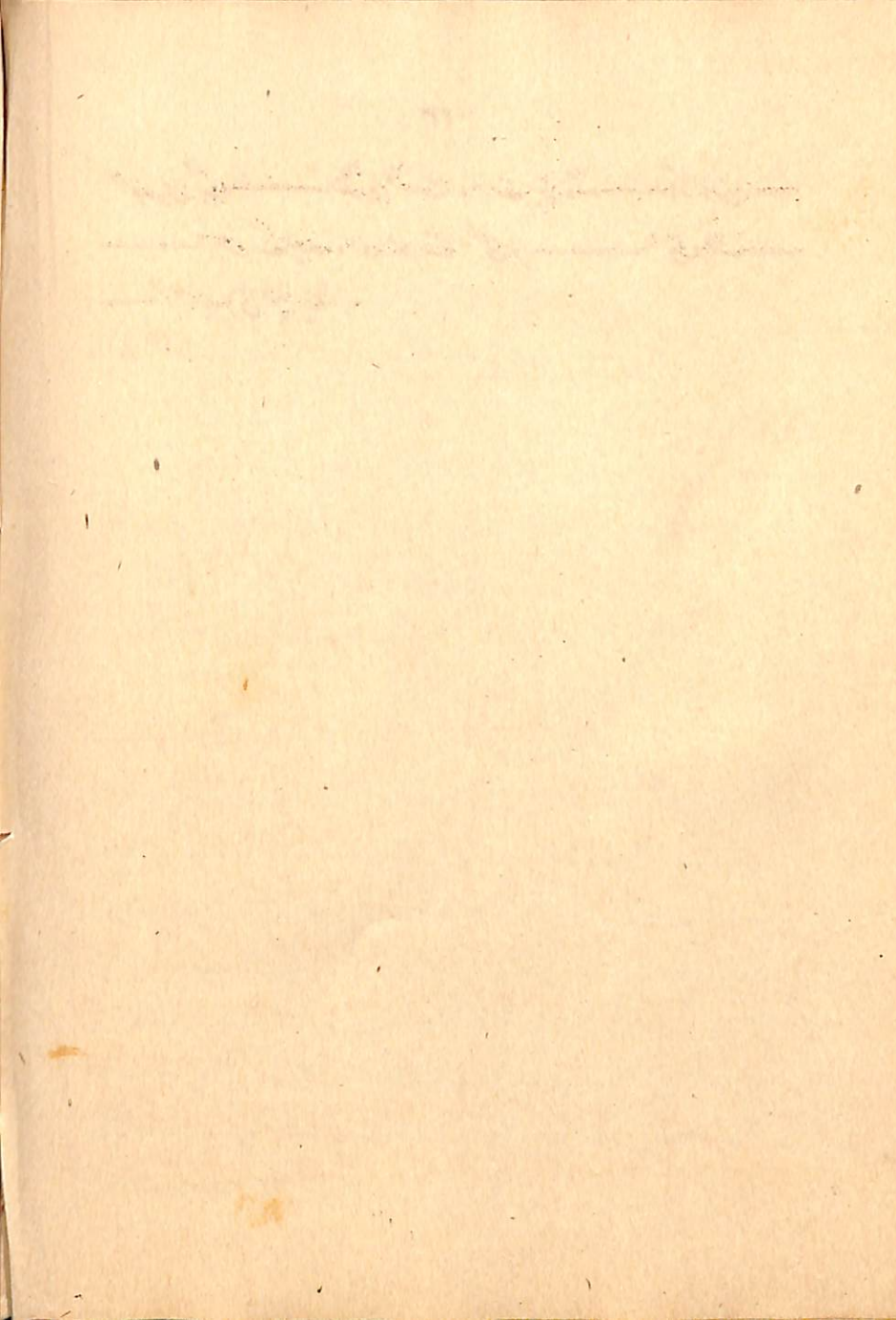
ہاتھ کا بڑھنا

رتنی نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا، اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
"دیکھو جی، مجھے درد ہوتا ہے۔"
"درد!" میں نے چونک کر کہا۔
"جی ہاں، دیکھئے نا۔ یہاں درد ہوتا ہے" اُس نے اپنا ہاتھ اور آگے کر دیا۔ میں غیر شعوری طور پر کچھ پیچھے ہٹ گیا، ایک جوان عورت کا ہاتھ ——— میں آج تک ایک جوان عورت کے ہاتھ کے لمس سے نا آشنا تھا۔
"دیکھتے کیوں نہیں"، پاس سے ایک خالہ چلّائی۔
دراصل میں رتنی کے ہاتھ کو چھونا چاہتا تھا اُس کے ہاتھ کے لمس

سے اپنے آپ کو محفوظ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن جب بیبا کی سے رتنی نے اپنا ہاتھ پیش کیا، اُس سے میں کچھ گھبرا گیا۔ وہ اکیلی نہ تھی، چاروں طرف نیم تاریکی سی رینگ رہی تھی، فضا پر ایک بے معنی سا جمود طاری تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زندگی یہاں آکر رُک گئی ہے اور اس نیم مردہ خاموشی میں خالائیں پھوپھیاں اور دیگر ادھیڑ عمر کی عورتیں میری طرف قہر آلودہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں، جیسے وہ خود اس جمود کا حصّہ ہیں زندگی کی بہتی ہوئی ندی میں وہ برف کے گلیشیر کی طرح، زندگی کو بے کیف، بے لذّت اور بے جان بنانے پر تلی ہوئی ہیں اور پھر اس جمگھٹے میں ایک جوان عورت کا ہاتھ مجھے گھور رہا تھا، میں نے چپکے سے رتنی کا ہاتھ پکڑ لیا، اور اس پھیلے ہوئے بے پایاں جمود کو توڑنے کی کوشش کی۔

"کہاں درد ہوتا ہے؟" میں نے کرخت آواز میں کہا، یہ آواز کی کرختگی ان بوڑھی عورتوں کے لئے تھی، اگر رتنی اکیلی ہوتی تو میں کس پیار بھرے انداز سے اُسے مخاطب کرتا، اُس کا اندازہ میں ہی کر سکتا ہوں۔

"یہاں" اُس نے منہ پُھلا کر کہا، نیلے سے ہونٹ کچھ سُرخ ہو گئے اور رخساروں پر گھنی پلکیں کانپنے لگیں۔

"یہاں کہاں، میں چلّایا، چلانا میرا مقصد نہ تھا، دراصل میں ان بوڑھی عورتوں کو بتانا چاہتا تھا، کہ مجھے اس ہاتھ سے کوئی رغبت نہیں، اور یہ ہاتھ مجھ پر ٹھونسا جا رہا ہے اور مجھے اس ہاتھ کے لمس سے کوئی تسکین

نہیں ہل سکتی۔

"آپ دیکھنے ہی نہیں، معلوم نہیں، آپ کا دھیان کدھر ہے" اور پھر آنکھوں کو مٹکاتے ہوئے رتنی نے میری طرف دیکھا۔

"میں تو کسی خراش یا چوٹ کو دیکھ رہا ہوں۔"

یہ سنکر رتنی نے اپنا ہاتھ جھٹک دیا اور پھر ادی کہکر اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا، ہاتھ نہایت ہی ملائم اور ریشمی تھا۔

"دیکھو جی یہاں درد ہوتا ہے۔"

"یہاں تو زخم وغیرہ کچھ بھی نہیں۔"

"تو کیا جہاں زخم ہوتا ہے، وہاں ہی درد ہوتا ہے۔" رتنی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں کہتا ہوں یہاں خراش وغیرہ کچھ بھی نہیں، پھر درد آپ کو کیسے اور کیوں ہوتا ہے" میں نے جھنجلا کر کہا۔

"تم کاٹھ کے اُلّو ہو" پاس سے ایک خالہ چلّائی، تمہیں بالکل شرم نہیں آتی، بیچاری درد سے کراہ رہی ہے، اور تم مذاق کر رہے ہو، جتنا کام رتنی نے اس بیاہ میں کیا ہے، اتنا کام تو تمام عورتوں نے ملکر نہیں کیا۔ بیچاری آٹا گوندھ رہی تھی، موچ آ گئی۔

"تو آپ فرماتی کیوں نہیں کہ آٹا گوندھتے گوندھتے موچ آ گئی، اچھا تو یہاں ٹنکچر لگے گا۔"

"کیوں جی لگا دوں؟" میں نے چڑاتے ہوئے کہا۔

"ٹنکچر سے تو یہ جگہ جل جائے گی!" اُس نے نتھنوں کو پھُلاتے ہوئے کہا۔"

"اچھا تو سرسوں کا تیل،

"اول ہول،

"کریم،

"اول ہول،

"گھی،

"بالکل نہیں،

"آپ گھی یا تیل وغیرہ کی مالش بالکل نہ کریں، ذرا ہاتھ سے مالش کر دیجئے۔

میں اس کے بیضوی چہرے کی طرف دیکھنے لگا، ٹھوڑی کچھ لمبی تھی، لیکن لب اپنی جگہ پر جامد تھے، آنکھیں روشن تھیں، چمک رہی تھیں بالکل ان سپید سپید سیپ کے بٹنوں کی طرح جو نیلے رنگ کے کوٹ میں ٹانک دیئے گئے ہوں

"جی ہاں، دیکھئے نا، اس انگوٹھے کے پاس مالش کیجئے، اپنے ہاتھ سے ذرا آہستہ آہستہ" اور پھر رتنی نے اپنے سپید دانتوں کی نمائش کی۔

"بس جی! آپ تو بہت زور سے مالش کرتے ہیں، غیر کا ہاتھ سمجھتے ہیں نا آپ،" اور جانے دی......... پھر میری طرف دیکھا اور ساڑھی کے پلّو کو ٹھیک کرتے ہوئے وہ ایک طرف ہو گئی۔

عورت ایک [illegible] ہے، میں نے سوچا، کاش یہ خطِ مستقیم ہوتی۔

“بیٹی ادھر آؤ۔ میں مالش کر دوں، ایک اور خالہ چلّائی۔

“نہیں چاچی جی، اب مجھے آرام ہے” اور وہ میرا منہ چڑاتے ہوئے چلی گئی۔

رتنی کے چلے جانے کے بعد میں سوچنے لگا کہ ہاتھ کا بڑھنا ٹھیک نہیں، یعنی ہاتھ کیوں بڑھا، اور پھر اتنی عورتوں کی موجودگی میں عجیب لڑکی ہے، نہیں جی عجیب عورت ہے۔ چاروں طرف تاریکی اونگھ رہی تھی، اور آس پاس کے مکان بے حس، جامد اور غیر متحرک معلوم ہوتے تھے، بالکل ان چچیوں اور خالاؤں کی طرح، جن کو وقت کے بے رحم ہتھوڑے نے بالکل کھنڈر کر دیا تھا، اور پھر میں سوچنے لگا۔ کہ واقعی رتنی کو درد ہوتا ہوگا، اور میں یونہی اِدھر اُدھر کی باتیں سوچ رہا ہوں، بھائی کی شادی میں مجھے اتنا کام کرنا پڑا تھا کہ مجھے اپنا ہوش ہی نہ تھا، رتنی کو آئے ہوئے چند دن ہی ہوئے تھے، لیکن ان چند دنوں میں تمام عورتیں اس کی گرویدہ ہو گئی تھیں، رتنی کے ہنس مکھ چہرے کو دیکھ کر خواہ مخواہ اُس سے باتیں کرنے کو جی چاہتا جیسے سے بات کرنی ہنسنے......، کبھی یہاں کھڑی ہے تو کبھی وہاں، جہاں دیکھو رتنی موجود تھی، اُس کے چہرے پر کبھی تھکن کے آثار نمایاں نہ ہوتے، میں نے رتنی کو تیسری بار دیکھا تھا۔ پہلی بار میں نے اُسے

ہسپتال میں دیکھا۔ جب وہ اپنے خاوند کے ساتھ آپریشن کرانے آئی تھی۔ میں رتنی کو بالکل نہ جانتا تھا۔ ایک دن اماں نے کہا کہ کرم چند کا خط آیا ہے کہ وہ رتنی کو لے کر یہاں آرہا ہے، وہ سیدھا ہسپتال جائے گا، کیونکہ رتنی بیمار ہے، چند دنوں کے بعد ماں نے مجھ سے کہا "بیٹا رتنی سے مل آؤ۔"

"یہ رتنی کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کرم چند کی بیوی ہے؟" ماں نے جواب دیا۔

"یہ کرم چند کون ہے؟"

"ہمارے گاؤں کے بہت بڑے رئیس ہیں دیکھو نا، لوگوں سے ملنا چاہیئے، تم تو دن رات گھر میں رہتے ہو، کبھی اس طرح بھی کام بنتے ہیں۔ لوگوں سے ملنا سیکھو، کرم چند بڑے آدمی ہیں گاؤں کے چودھری ہیں، اب دوسری شادی کی ہے، پہلی بیوی سے کوئی بچہ نہیں ہوا تو دوسری شادی کرلی، کیا ہوا، جو عمر رسیدہ ہیں، اگر بال سفید ہیں تو خضاب بھی لگاتے ہیں ان بڑے آدمیوں کا کیا کہنا، اتنی بڑی جائداد ہے، اگر کوئی وارث نہ ہوا تو یہ جائداد کہاں جائے گی۔ کرم چند بڑے ہنس مکھ آدمی ہیں، دیکھو اُن سے مل آؤ، اُن سے کہنا کہ چاچی کی طبیعت خراب تھی، اسلئے وہ نہیں آسکیں۔"

اور میں ایک فرمانبردار بیٹے کی طرح ہسپتال چلا گیا، دیکھتے ہی کرم چند نے مجھے گلے لگا لیا، اور کہنے لگا "رتنی میں آج ہی کہہ رہا تھا کہ

چاچی ضرور ملنے آئیں گی، ہاں اگر چاچی نہیں آئی تو دیویندر تو آہی گیا نا۔ رتنی تو چاچی کو نہیں جانتی، بڑی نیک عورت ہے، ہماری برادری میں اگر کوئی سمجھدار عورت ہے تو بس تمہاری چاچی، دیویندر تو خوب لمبا چوڑا جوان ہو گیا ہے، اسے چھوٹا سا تھا، جب میں نے پہلی بار دیکھا یونہی دُبلا پتلا سا تھا، اب تو اچھا خاصا جوان ہے، اچھا تو چاچی کیوں نہیں آئی؟"

"اُن کی طبیعت خراب تھی؟"

"اوہ، جبھی تو، ورنہ وہ ضرور آتیں، وہ کبھی نہ رک سکتی تھیں، اچھا رتنی جب تمہارا اپریشن ہو جائے گا اور تم تندرست ہو جاؤ گی تو ہم تمہیں چاچی کے پاس لے چلیں گے؟"

رتنی نے کوئی جواب نہ دیا، اور چھت کی طرف دیکھنے لگی۔ کرم چند جواب نہ پاکر کھسیانہ سا ہو گیا۔

کرم چند اور رتنی میں کافی تفاوت تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کرم چند زندگی ختم کر چکا ہے، اور رتنی نے زندگی شروع کی ہے، کرم چند کی شکل نہایت ہی بھونڈی تھی، موٹے موٹے ہونٹ، بڑھی ہوئی ناک، چہرے پر چیچک کے داغ، اور سر پر ایک تھان پگڑی کا، ناک کے نتھنے پھیلے ہوئے، اور ایک نہایت ہی واہیات سی ہنسی جو اُس کے لبوں پر پھڑکتی رہتی۔ لیکن رتنی خوبصورت ضرور تھی، خوبصورت کے علاوہ اُس میں کچھ اور بھی تھا، شاید وہ تھی اُس کی شخصیت، جو ندواد پر چھا جاتی

تھی، اُس وقت وہ ہسپتال کی آہنی چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی، اُس کے سرہانے ڈاکٹری معائنہ کا چارٹ لٹک رہا تھا۔ اور تھوکر اس سے فینائل کی بو آ رہی تھی۔ سامنے اسٹول پر ایک ادھیڑ عمر کی عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ جو سر سے لے کر پاؤں تک گھٹنوں سے اٹی ہوئی تھی، اس نے نہایت ہی بھدے پن سے میری طرف دیکھا اور موٹے موٹے ہونٹوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا، اور لمبے لمبے مٹیالے دانت پیش کر دیئے اتنی صفائی کے باوجود کمرہ بدصورتی کا مرقع بنا ہوا تھا، کمرے میں اگر کوئی جاذب نظر چیز تھی تو صرف رتنی کا چہرہ، رتنی کا رنگ کافی گورا تھا، رنگ کا سفید ہونا، کوئی خوبصورتی کی علامت نہیں ہے گو ہندوستان میں ہر سفید چمڑے والی عورت کو خوبصورت تسلیم کیا جاتا ہے، چاہے اس کے خدوخال کتنے بھی بے ملتے ہوں۔ رتنی کے چہرے کی بناوٹ نہایت البیلی اور چہرہ بیضوی طرز کا تھا، ٹھوڑی پُرشکوہ، آنکھیں کچھ کچھ بیباک اور متجسس، جیسے وہ کچھ تلاش کر رہی ہیں۔ لیکن ہونٹ، اُن ہونٹوں پر ڈوبتے ہوئے سورج کی لالی تھی۔ آنکھیں، ٹھوڑی، اور لب یہ تین چیزیں تھیں، جنمیں شخصیت کا راز مضمر تھا، یہ تین چیزیں اس کی زندگی کی مکمل تصویر پیش کرتی تھیں۔

اور میں دیر تک رتنی کی طرف دیکھتا رہا۔

"تمہاری چاچی تو گرمیوں میں سری نگر چلی جاتی ہے، اس دفعہ تم

بھی سرینگر چلی جاتا۔ کئی بار چاچی نے لکھا بھی، کہ رتنی کو سری نگر بھیج دو، لیکن میں نہ بھیج سکا، ابکے تم ضرور جانا، آب و ہوا بدل جائے گی، اور صحت بھی اچھی ہوجائے گی۔

کرم چند نے یہ الفاظ نہایت پیار بھرے انداز میں کہے۔

رتنی نے سر کو جھٹک دیا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک بوجھ کو اپنے سر سے اُتار رہی ہے اس کا چہرہ متغیر سا ہو گیا، اور آنکھیں اُداس ہوتی گئیں، ایسا ظاہر ہوتا تھا جیسے اُسے کمرے کے ہر فرد سے نفرت ہے اور وہ چاہتی ہے کہ بے معنی گفتگو کو بند کیا جائے، تو نہایت موزوں بات ہو گی۔

"جی ہاں سری نگر ان کے لئے بہت اچھی جگہ رہے گی" میں نے جواب دیا، اور میری آنکھوں کے سامنے نیلا آسمان پھیلتا گیا، گھاس کے نرم نرم خوشے میرے پاؤں کے تلے سرکنے لگے۔ کسی کی متجسس آنکھیں پر شکوہ ٹھوڑی اور نرم اور چمکیلے ہونٹ آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے میری نظریں کسی کے گول گول بازوؤں پر جم گئیں، اور بلاؤز سے دو اُبھرے ہوئے نقطے بھی جھانکنے لگے ——— اتنے میں ڈاکٹر آگیا، اُس نے تھرمامیٹر نکالا اور رتنی کے منہ میں ٹھونس دیا، اور کہنے لگا" دس بجے اپریشن ہو گا"

اس ملاقات کے بعد میں چلا آیا، اس کے بعد ہسپتال نہ جاسکا اور کرم چند سے یہ بھی نہ پوچھ سکا کہ رتنی کو کیا بیماری تھی، اور اس کا کیوں

اپریشن ہونے والا تھا، کچھ دنوں کے بعد میں نے اماں سے اپریشن کی وجہ پوچھی تو انہوں نے جواب دیا کہ عورتوں والی بیماری ہے، میں چپ سا ہو گیا، اور.... سوچا ہو گی کوئی عورتوں والی بیماری۔ ہم مردوں کو عورتوں والی بیماری سے کیا واسطہ!

ایک سال کے بعد رتنی مجھے انار کلی میں دکھائی دی۔ وہ ٹانگے میں بیٹھی ہوئی تھی، اُس کے بائیں ہاتھ میں ایک خوبصورت سا بٹوہ تھا، شاید عورت بٹوہ کے بغیر نامکمل معلوم ہوتی ہے، میں نے نمستے کہنی چاہی لیکن نہ کر سکا، کچھ جھجک سا گیا، ایسا معلوم ہوا جیسے میں اپنا راستہ بھول گیا ہوں، رتنی نے میری طرف نہ دیکھا اور میں آگے بڑھ گیا اور سوچنے لگا۔ شاید ٹانگہ والی عورت رتنی نہ تھی، شاید کوئی اور لڑکی تھی، اور آج جب وہ بھائی صاحب کی شادی میں آئی تو پرانی یادیں تازہ ہو گئیں، اور ذہن کی چادر پہ پرانی تصویریں اُجاگر ہوتی گئیں اور آج جب رتنی کا ہاتھ میری طرف بڑھا تو میں پکڑنے کے لئے تیار نہ تھا پکڑنے کے لئے تیار کس طرح ہوتا، پرانے تصوّرات کی جگہ نئے تصوّرات نے لے لی تھی۔ اور یہ نیا جھٹکا میرے لئے بالکل بے قافیہ شاعری کی طرح تھا جسے لوگ سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے، ان اشعار میں معانی زیادہ ہوتے ہیں، خیالات زیادہ ٹھوس اور جاندار ہوتے ہیں،

شادی کے دوران میں اکثر میری اور رتنی کی مٹھ بھیڑ ہو جاتی، کبھی کبھی ڈرائنگ روم میں، جہاں وہ ایک قدِ آدم آئینہ کے سامنے اپنے بال سنوارنے لگتی، اور کافی دیر تک اپنے بالوں میں کنگھی کرتی رہتی اور میں ایک کونے میں کھڑا ہو کر اُس کے سیاہ لمبے بالوں کی طرف دیکھتا رہتا، اگر کسی کے پاؤں کی آہٹ پا کر میں کمرہ سے باہر نکل جاتا۔ تو وہ میری طرف عجیب انداز سے دیکھتی، ان نظروں میں کتنا خلوص اور پیار تھا، اور پھر اس رات تاش کھیلتے ہوئے اس نے میری آنکھوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا، اور میرے کان میں چپکے سے کہا، "بتاؤ میرے ہاتھ میں کونسا پتہ ہے۔" رتنی کا گرم سانس میرے رُخساروں کو چھوتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

"ارے میں کیا بتاؤں، میری آنکھیں تو تم نے بند کر لی ہیں"

اُس نے میری آنکھوں کو اپنے ہاتھوں سے اور زور سے دبایا اور کہنے لگی "اب بتاؤ" آواز میں لرزش تھی۔

"اینٹ کی دُکی" میں چلایا۔

"غلط، لو دیکھو، پان کی بیگم ہے، اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس ہنسی میں رتنی کی روح کھلکھلا کر ہنس پڑی ہے، اس ہنسی میں کتنی موہنی اور جاذبیت تھی۔ اُس کا چہرہ اور ملبوتر ا ہو گیا۔ مجھے بیضوی چہرہ کتنا پیارا معلوم ہوتا ہے۔

اُس نے میرا کان کھینچا، اور کہنے لگی "مجھے گھورتے ہو؟"

"اجی شرم نہیں آتی"۔ میں شرارت کے انداز میں بولا۔

"شرم تو آپ کو آنی چاہیئے، جو گرمیوں میں بھی گرم پیلیٹ پہنے ہوئے ہیں" اور میری دیکھ کر مسکرائی۔

"گرم پیزیٹ، تمہارا کیا مطلب ہے"!

گرم پیزیٹ" اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی، اور باقی لڑکیاں بھی مسکرا دیں، اور مجھے ایسا محسوس ہؤا کہ رتنی کی ہنسی نے اس جمود کو توڑ دیا ہے، لڑکیوں کی آنکھیں کھلنے لگیں، اور ان کے رخساروں پہ ایک اول آویزی آگئی، اور ان کے لبیا ایک نامعلوم جذبہ سے کانپنے لگے، اور اب ایسا معلوم پڑتا تھا کہ رتنی کی شخصیت کا اثر باقی لڑکیوں میں بھی سرایت کر رہا ہے، جیسے وہ بھی اس زندگی کو پانے کے لیئے اتنی بیقرار ہیں، حقیقتاً کہ رتنی، اور رتنی برابر میری طرف دیکھتی رہی اور اس کی آنکھیں مجھ سے کہتی رہیں کہ "تم بڑے انجان ہو، بھولے ہو، اور میں انجان نہ تھا، میں اُن آنکھوں میں ہر چیز کو دیکھ سکتا تھا، وہ آنکھیں کیا چاہتی تھیں ——

اور جب شادی ختم ہو گئی تو رتنی کہنے لگی کہ وہ کچھ دن اور ٹھیرے گی۔ یہ سنکر مجھے بہت مسرّت ہوئی، اور اب میں نے سوچا کہ جب سب رشتہ دار چلے جائینگے، تو رتنی سے اپنے دل کا حال کہونگا۔ گرمی چند بھی چلا جائیگا، اور ہمیں باتیں کرنے کا کافی موقع مل جائیگا۔

اور پھر اُس دن کرم چند نے بھی مجھ سے کہہ دیا کہ رتنی کچھ عرصہ یہاں ٹھیرے گی، دیویندر تم رتنی کا خیال رکھنا، یہ کہہ کر وہ بیوقوفوں کی طرح ہنسنے لگا، اُس کی موٹی توند اور پھیل گئی، اور چہرے کا رنگ زیادہ سیاہ ہوگیا۔

"جی، کیوں نہیں، یہ تو ان کا اپنا گھر ہے۔" میں نے نظر بچا کر کہا۔

"رتنی کا جی تو گاؤں میں نہیں لگتا۔"

"گاؤں میں کیا دھرا ہے جی۔"

"اور رتنی شہر کی لڑکی ہے نا، گاؤں میں کیونکر جی لگے۔"

"جی ہاں۔"

"گھر پر تو یہ ٹھہرتی ہی نہیں، یہی پانچ دس دن ٹھیرے گی، پھر کہے گی میں امرتسر جاؤں گی، لاہور جاؤں گی۔"

"امرتسر کیوں جاتی ہے؟"

"ارے آپ کو یہ معلوم نہیں، وہاں اس کی ماں رہتی ہے۔"

"اور لاہور۔"

"وہاں اس کی بچپن کی سہیلی رہتی ہے، میں تو اسے اکیلا بھیج دیتا ہوں، ساتھ کون جائے، اور آجکل کی لڑکیاں تو اکیلی گھومنا زیادہ پسند کرتی ہیں، اور پھر ہم ٹھیرے گاؤں کے زمیندار، اُجڈ، گنوار تہذیب سے ناواقف۔ جنہیں کرسی پر بیٹھنا نہیں آتا۔"......

اتنا کہہ کر کرم چند مسکرانے لگے۔

اُن کی مسکراہٹ میں عجیب قسم کی طنز تھی، جیسے وہ مسکراہٹ مجھ سے کہہ رہی تھی۔ کہ اتنا بھولا بننے سے ان باتوں پر پردہ نہیں پڑتا۔

"جی۔ بھلا۔ آپ تو یوں ہی کہتے ہیں، آپ تو سب کچھ جانتے ہیں۔"

اور اتنے میں رتنی آ گئی، وہی بیضوی چہرہ، خوبصورت چمکتی ہوئی آنکھیں، رتنی نے سفید رنگ کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی، اور اس کے جسم کے خطوط اس سفید ساڑھی میں زیادہ نکھر آئے تھے، اُس نے اپنے خاوند کی طرف مسکرا کر دیکھا، اور پھر میری طرف، آج آنکھوں میں بیباک پن زیادہ تھا، جیسے وہ کہہ رہی ہے کہ ان سے کیا باتیں کرتے ہو، مجھے یہ بالکل ناپسند ہیں، دیکھتے ہو، یہ بڑھا ہؤا پیٹ، منہ پر چیچک کے داغ، بے ڈول جسم، اور پھر بے معنی قہقہے تم کہاں رہے اتنے دن، تم اس سے پہلے کیوں نہ ملے، اگر مل بھی جاتے تو کیا ہو جاتا، کیا ہم ایک دوسرے کے ساتھ شادی کر سکتے، ایسا بھی کبھی ہؤا ہے، کاش اس طرح ہو سکتا، لیکن میں تمہیں پسند کرتی ہوں، تم خوبصورت ہو کافی خوبصورت ہو، کم از کم اس انسان سے زیادہ پیارے اور حسین ہو، مجھے رتی بھر ان سے محبت نہیں، شادی کے دن ہی مجھے ان سے نفرت ہو گئی تھی، یہ بڑے فراخ دل ہیں، میرے ہر ناز نخرے کو برداشت کرتے ہیں، میں ان کے گھر بالکل نہیں ٹھہرتی، جی ہی نہیں لگتا، کبھی یہاں، کبھی وہاں، آج کل تمہارے گھر ٹھہری ہوئی ہوں، جب یہ

چلے جائیں گے تو، پھر ——— پھر میں تم سے باتیں کروں گی مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں، میں بہت ہی باتیں کرنی ہوں، تم میری باتیں سنتے سنتے تھک جاؤ گے، اچھا اب تم جاؤ، کیوں بیوقوفوں کی طرح میری طرف دیکھ رہے ہو، کیا کبھی تم نے کوئی حسین عورت نہیں دیکھی، اگر دیکھی ہے تو تم نے اُسے کبھی ہاتھ تک نہیں لگایا، اچھا جاؤ بھی، میری طرف گھور گھور کر نہ دیکھو، میں اپنے خاوند سے باتیں کرنا چاہتی ہوں، میں ان سے روپے لوں گی، تم تو کچھ بھی نہیں کماتے دن رات بیکار بیٹھے رہتے ہو، میں یہاں ٹھیروں گی تو خرچ تو ضرور ہوگا، اب میں مسکراؤں گی، اب ان سے ہنسی مذاق کی باتیں کروں گی، ان کی توند کو چھیڑوں گی، یہ ہنس پڑیں گے، میں شادی شدہ عورت ہوں اور مجھے زندہ رہنا ہے، مجھے اپنی زندگی سے محبت ہے، ان سے محبت نہیں، اگر یونہی جلتی سڑتی رہوں تو جلد مر جاؤں گی، اور میں مرنا نہیں چاہتی، یہ زندگی بڑی عجیب ہے، نہایت ہی پیاری ہے، اور جب کبھی تم جیسے نوجوان مل جاتے ہیں تو اور بھی خوشگوار ہو جاتی ہے، کبھی گاؤں میں آؤ نا۔ یہ گاؤں کے بہت بڑے رئیس ہیں ان کے پاس کافی روپیہ ہے، اسی لئے تو میری ماں نے ان سے شادی کر دی، لیکن میں اس روپیہ کا استعمال کر رہی ہوں، اب تم جاؤ ——— تم ابھی تک یہیں کھڑے ہو، اور پھر رتنی نے اشارہ کیا، اور میں چلا آیا۔

دوسرے دن کدم چند میرے کمرے میں آیا اور کہنے لگا: "اچھا بھئی ہم تو تیار ہو گئے"

"اوہ، آپ تیار ہو گئے"؟ دراصل میں بہت خوش تھا۔

"اچھا تو اب کب ملاقات ہو گی"؟

"اب تو تمہاری شادی میں آئیں گے، کیوں بلاؤ گے نا"؟

"کیوں نہیں، اور پھر رتنی کے بغیر گھر کا کام کاج کس طرح چلے گا"

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے، رتنی تمہیں بہت چاہتی ہے"۔ آواز میں کچھ گھبراہٹ تھی۔

"مجھے"

"ہاں ہاں، تمہیں، اس میں کیا ہے، وہ بڑی سیدھی سادھی لڑکی ہے، بالکل میری پہلی بیوی کی طرح، شانتی کی طرح، پرماتما اُسے سوگ نصیب کرے، بیچاری نے کبھی کوئی شکایت نہ کی، بچے کی اُمیدیں دم توڑ گئی، دبو ندر، کیا بتاؤں، اُس عورت میں کتنا ایثار تھا، کتنی محبت تھی، اُس کی ایک ہی آرزو تھی، کہ اُس کے ہاں اولاد ہو جائے، لیکن اولاد نہ ہوئی، ہر طرح کا علاج کیا لیکن کچھ نہ بنا، اور وہ مر گئی، بیچاری کو تپ دق ہو گیا تھا، اور اب رتنی بھی اسی طرح اولاد کے لئے نڈھال ہو رہی ہے۔ کبھی یہاں، کبھی وہاں، گھر میں تو رتنی ہی تھی، کیا بتاؤں، دبوندر، رتنی کی طبیعت، شکل وصورت، خدوخال

اطوار میں کہتا ہوں ہر چیز نشانتی سے ملتی ہے، معلوم ہوتا ہے شانتی نے رنتی کے بھیس میں دوبارہ جنم لیا ہے، آج ہی مجھے ایک دوست کا تار آیا ہے۔

"کیا لکھا ہے؟"

"یہ کہ یہاں آؤ، ایک بڑے سادھو مہا تما آئے ہوئے ہیں اور وہ اولاد کا شرطیہ علاج کرتے ہیں۔ اور"

"تو پھر" میں نے بات کاٹ کر کہا۔

"اس لئے رنتی بھی میرے ساتھ جا رہی ہے۔"

ر ـــــــ ت ـــــــ نی ـــــــ میں آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

"نمستے۔ دیوندر۔ اور رنتی آ کھڑی ہوئی رنتی مسکرا رہی تھی، اُس مسکراہٹ میں مسرت نام تک کو نہ تھی، یونہی وہ کھلے ہوئے لب جو بے اختیار کہہ رہے تھے کہ مجھے بچوں سے کوئی محبت نہیں، میں اولاد نہیں چاہتی، اگر انہیں اولاد کی ضرورت ہے، تو میں کیا کروں اور کیا اس دنیا میں عورتوں کا ہی اپریشن ہوتا ہے۔ مردوں کا نہیں ہوتا، کیا نقص ہمیشہ عورتوں میں ہوا کرتا ہے، لیکن مجھے ایسے بیہودہ سوالات نہیں کرنے چاہیئے، یہ میرے پتی ہیں، میرے آقا، میرے اَن داتا اور مجھے ان کا حکم ماننا ضروری ہے۔

"کیا آپ بھی تیار ہو گئیں؟"

"میں پھر آؤں گی" اور وہ میری طرف دیکھنے لگی، اُس کے سر سے ساڑھی سرک گئی تھی، اور اُس کے سیاہ بال سورج کی کرنوں میں چمک اُٹھے تھے، داہنے رخسار میں ہلکا سا خم پڑ گیا تھا، اور ٹھوڑی زیادہ لمبوتری ہو گئی تھی، جی چاہتا تھا کہ ٹھوڑی کے نچلے مرمریں حصّہ کو چوم لوں۔

"نمستے" اُس نے پھر کہا، اور میں اُس کی آنکھوں کی طرف دیکھنے لگا، جیسے وہ آنکھیں کہہ رہی تھیں، میں پھر آؤں گی، مجھے بھول نہ جانا اور پھر اُس کا ہاتھ میری طرف بڑھتا ہوُا معلوم ہوُا، اور ایسا محسوس ہوُا، جیسے میرے گلے کو کوئی دبوچ رہا ہے، اور میرا سانس رُک رُک کر آنے لگا۔ اور میں دیر تک اسی حالت میں کھڑا رہا، حتیٰ کہ رتنی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

رتنی چلی گئی، وہ کیوں چلی گئی، میں سوچنے لگا، لیکن مجھے کیا، وہ جس کی تھی اس کے ساتھ چلی گئی، وہ کرم چند سے بیاہی ہوئی تھی پنڈت نے وید منتر پڑھ کر بیاہ کرایا تھا، یہ کوئی اغوا نہ تھا، کرم چند رتنی کو زبردستی اُٹھا کر نہیں لایا تھا، وہ چلی گئی —— وہ کیوں چلی گئی، وہ کہتی تھی، میں ٹھیروں گی، میں تم سے باتیں کروں گی، بہت سی باتیں، اتنی باتیں کہ تم سنتے سنتے تھک جاؤ گے —— اُس نے کیا کیا؟ وہ باتیں کئے بغیر چلی گئی، اور پھر مجھے وہ منظر یاد آیا، جب وہ آئینہ کے

سامنے کھڑی ہو کر اپنے بالوں میں کنگھی کیا کرتی تھی ۔ نرم نرم بال سیاہ اور چمکدار، اور پھر وہ اپنا چہرہ دیکھ کر مسکرا پڑتی تھی، جیسے اُسے اپنی خوبصورتی کا پورے طور پہ احساس تھا، وہ دیر تک بالوں میں کنگھی کرتی رہتی ....

.. .. وہ دیر تک بالوں میں کنگھی کرتی رہتی، جیسے اُسے کنگھی کرتے ہوئے انتہائی لطف آرہا تھا، شاید دنیا میں سب سے زیادہ آسان اور پیاری چیز اپنے بالوں میں کنگھی کرنا ہے، بال کنگھی کے لمس سے بیدار ہو جاتے ہیں، اور پھر آہستہ آہستہ ذہن بیدار ہو جاتا ہے اور خیالات ——— رتنی خوبصورت تھی، وہ واقعی خوبصورت تھی، لیکن مجھے کیا، وہ شادی سے پہلے کہاں تھی، اُس نے میرے ساتھ شادی کیوں نہ کی، یا میں اُس سے شادی کیوں نہ کر سکا، میں اُس کی شادی سے پہلے کہاں تھا، اور پھر اسطرح کیوں ہوا، وہ مجھے شادی کے بعد کیوں ملی، لیکن میں ابھی تک کنوارا ہوں لیکن رتنی اچھی تھی، مجھے وہ پسند تھی، میں اُسے پسند کرتا تھا، وہ کیوں چلی گئی، رتنی نے انکار کر دیا ہوتا، وہ اپنے خاوند سے کہہ دیتی کہ وہ نہیں جاتی وہ یہاں ٹھہرے گی، اُس نے شادی کیوں کی، وہ صاف کہہ دیتی کہ وہ اس شخص سے شادی نہیں کر سکتی، اُسے اس شخص سے نفرت ہے، اور وہ میرا انتظار کرتی، لیکن کہاں ——— کب اور کیوں ——— رتنی عجیب عورت ہے، میں اُسے چاہتا ہوں، مجھے وہ خوبصورت معلوم ہوتی ہے، نہایت ہی خوبصورت

——— لیکن میں ——— میں ——— اکیلا ہوں ——— میں ہمیشہ اکیلا

رہ جاتا ہوں، لیکن میں نے ہی رتنی کو روک دیا ہوتا، میں اُسکے خاوند سے کہہ دیتا کہ مجھے رتنی اچھی لگتی ہے۔ یہ پھول کیوں خوبصورت ہیں، یہ آسمان کیوں نیلا ہے، ہوا میں کیوں شہد جیسی مٹھاس ہے، رتنی کو کچھ دنوں کے لئے یہاں ہی رہنے دو، کیا ——— اچھی کا کیا مطلب نہیں، نہیں وہ مجھے پسند ہے، مجھے اُس کی ٹھوڑی پسند ہے، اُس کا بیضوی چہرہ، اُس کی آنکھیں، اور اس کا ہاتھ، اور پھر اس کا ہاتھ بڑھتا ہوا معلوم ہوا یہاں درد ہوتا ہے انگوٹھی کے پاس شفاف ملائم جلد ہاں، ملائم، اور خوبصورت رتنی مجھے پسند ہے نہیں نہیں وہ حسین ہے حسین نہیں، خوبصورت ——— خوبصورت ——— خوبصورت ——— رتنی، تم بہت اچھی ہو، لیکن ان باتوں سے کیا ہوگا۔

چاندی کے تار

اب جبکہ تمہاری شادی ہو چکی ہے اور تم ایک دوسرے شخص کی آغوش میں جا چکی ہو مجھے تمہیں خط لکھنے کا حق حاصل ہو گیا ہے گویا ایک عجیب سی بات ہے کہ جب تم خط لکھتی تھیں تو میں جواب دینے سے قاصر تھا اور اب میں تمہیں خط لکھ رہا ہوں لیکن تم اس خط کا جواب دینے سے معذور ہو گی میرے لئے یہ بوجھ بھی ناقابلِ برداشت ہے کہ میں ایک شادی شدہ عورت کو خط لکھوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اس خط کا تمہارے خاوند پر کیا اثر ہو گا اگرچہ میں اس امر کی پوری کوشش کروں گا کہ یہ خط سیدھا تمہارے پاس پہنچے اور تمہارے خاوند کو اس خط کا علم ہی نہ ہو لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ یہ خط تمہارے شوہر کو مل جائے۔ یونہی ڈاکیہ غلطی کر سکتا ہے اور اُس کے

بعد جو کچھ ہوگا میں اُس کا بھی تصوّر کر سکتا ہوں کیونکہ ایک ہندوستانی شوہر یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی دوسرا مرد اس کی بیوی کو خط لکھے اور پھر یہ حقیقت اُس پر آشکار ہو کہ اس کی بیوی کسی اور سے محبت کرتی رہی ہے، اور اب تک یہ راہ و رسم جاری ہے۔ اس بھید کا کسی ہندوستانی خاوند پر کھلنا۔ کوٹھے کے بھونچال کے مترادف ہوگا۔ وہ اپنے شباب کی غلطیوں کو نظر انداز کر سکتا ہے۔ آخر ہر شخص شادی سے پہلے محبت کرنا چاہتا ہے اور کرتا ہے اگر اُسے موقعہ مل جائے لیکن یہ حق شاید عورت کو حاصل نہیں، وہ تو محض ایک جانور تصوّر کی جاتی ہے جو ماں باپ کی کڑی نگاہوں میں مقید رہتی ہے۔ ایسے شوہروں کے لئے عورت ایک مقدس چیز ہے ایجنٹا کی تصویر کی طرح محض ایک دیوی جس پر جذبات کا اثر نہیں ہو سکتا جس پر ماحول کبھی حاوی نہیں ہوتا جس پر زمانے کے نشیب و فراز کوئی اثر نہیں۔ آجکل کی لڑکیاں اس امر کی گواہ ہیں کہ زمانے کی بدلتی ہوئی رو نے، حالات اور ماحول نے ان پر کیا اثر کیا ہے اور اگر ان باتوں کو لوگ سمجھ جائیں تو شاید دنیا میں خودکشی کرنے والوں کی تعداد آدھی رہ جائے خاوند عورتوں کو پیٹنا چھوڑ دیں اور ہر گھریلو جھگڑے کے بعد طلاق کی دھمکی نہ دیا کریں۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ دراصل بات یہ ہے کہ اگر یہ خط تمہارے خاوند کو مل جائے اور تمہیں وہ لعنت ملامت کرے یا پیٹے تو ان باتوں کو نظر انداز کر دینا اور ان تکلیفوں کو ماضی کے خوشگوار لمحوں کی خاطر سہہ لینا۔ گو میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کی توقع کرنا محض

بے وقوفی ہے کیونکہ تم مجھے گالیاں دو گی، لعنت بھیجو گی اور کہو گی کہ کیوں
بیٹھے بٹھائے ایک نیا فتنہ اُٹھا دیا۔ لیکن میں اس فتنے کو ہمیشہ کے لئے ختم
کرنا چاہتا ہوں، گو تمہارے لئے یہ فتنہ اسی دن ختم ہو گیا جس دن تمہاری
شادی ہوئی۔ لیکن میں ابھی تک کنوارا ہوں، اور یہ فتنہ سو سو کر جاگ
اٹھتا ہے۔ اور مجھے بار بار پریشان کرتا ہے، یہ پریشانیاں میری
دماغی نشوونما کے لئے اچھی نہیں۔ یہ کسک، جو دل میں بار بار اٹھتی ہے،
اُسے ایک بار کیوں نہ نیست و نابود کر دوں۔ تمہاری محبت کا قصہ
میرے لئے اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے، جتنا کہ ایک سائنسدان کے لئے
جراثیم کی ایک نئی سلائیڈ۔ جو اُس نے ابھی ابھی تیار کی اور خوردبین کے
نیچے رکھ کر اُسے نہایت انہماک سے دیکھ رہا ہو۔ گو تمہاری محبت کا
قصہ پرانا ہو گیا۔ اور اُس پر شادی کا رنگ چڑھ چکا۔ لیکن میرے
پاس چند ایسی چیزیں ہیں جو مجھے بار بار تمہاری یاد دلاتی ہیں۔ تمہاری
چند مسکراہٹیں۔ تمہارے خط، تمہارا ریشمی رومال۔ جو تم نے دیوالی کے
روز اپنی ننھی بنّو کے ہاتھ بطور تحفہ بھیجا تھا۔ گو تمہاری مسکراہٹوں کی
جگہ اب نئی مسکراہٹیں آ چکی ہیں۔ اُن کی جگہ اور دلفریب لبوں نے لے
لی ہے اور ان کا اثر میرے کمزور اعصاب پر زیادہ پڑتا ہے۔ لیکن ان
مسکراہٹوں میں بناوٹ ہے۔ اور اُن میں وہ شے لطیف نہیں جو تمہارے
تبسم میں تھی۔ تمہارا تبسم بالکل البیلا، انوکھا نرالا تھا۔ شاید تم نے پہلی بار
مسکرانا سیکھا تھا۔ اس مسکراہٹ میں ایک نیا پن تھا۔ جس میں تم نے

والے شباب کی صبح تھی۔ ایک انجان معصوم مسکراہٹ۔ بناوٹ سے کوسوں دور ایک بھیگی ہوئی صبح کی طرح شگفتہ، تر و تازہ، شبنم کی طرح ٹھنڈی اور چمک دار شعلہ کی طرح سُرخ اور آگ لگانے والی۔ ا______و______ لیکن میں اب ان مسکراہٹوں کو بھول چکا ہوں اب صرف اُن کا تجزیہ کر سکتا ہوں بالکل ایک ڈاکٹر کی طرح جو ایک مرض کو دوسرے مرض سے تشخیص کر لیتا ہے۔ اب بھی کوئی نہ کوئی میری طرف دیکھ کر مسکرا لیتا ہے۔ اور یہ مسکراہٹ بجلی کے کوندے کی طرح مجھ پر حملہ کرتی ہے۔ حملہ نہایت شدید ہوتا ہے۔ سرتاپا اک جھرجھری سی آجاتی ہے۔ لیکن دوسرے لمحے میں، میں سنبھل جاتا ہوں اور اس مسکراہٹ کا تجزیہ کرنے لگتا ہوں۔

ہم ایک مشینی دور میں سے گذر رہے ہیں۔ ہم اس زمانے میں پیدا ہوئے جب پانی اور ہوا، پر انسان نے قابو پا لیا ہے ہم وقت رفتار اور فاصلے پر حاوی ہو چکے ہیں۔ اب روحانی باتوں کا زمانہ نہیں، بالکل مادی چیزوں کا تذکرہ ہوتا ہے۔ اور اس لئے مسکراہٹیں بھی مادی ہو گئی ہیں۔ اور جب میری طرف کوئی مسکرا کر دیکھتا ہے تو سوچنے لگتا ہوں، کہ اس مسکراہٹ کا کیا مطلب ہے اگر میں بھی مسکرا دوں تو مجھے کیا فائدہ پہنچے گا، اور اگر نہ مسکراؤں تو کیا نقصان ہو گا۔ آجکل ہر چیز نفع اور نقصان کے معیار پر پرکھی جاتی ہے۔ لیکن تمہاری مسکراہٹوں میں وہ بات نہ تھی، اگر ہوتی، تو آج مجھے یوں نہ یاد آتیں۔ تم اسی بات کو لو کہ صرف ایک مسکراہٹ پر کتنا جھگڑا

کیا گیا ہے۔ آجکل تو بال کی کھال اتاری جاتی ہے۔ ہر چیز کا نفسیاتی پس منظر تلاش کرنا پڑتا ہے اور اُس کا اثر اعصاب پر دیکھنا ہوتا ہے، اور پھر تجزیہ۔ اب یہ محبت نہیں ہے۔ محض سرد ردی ہے۔ ایک بہانہ ہے اپنے آپ کو ختم کرنے کا لیکن کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ شاید یہ اقدار پرانی اقدار سے اچھی ہیں۔ ہو سکتا ہے۔ اگر ہم ان اقدار کو اپنے آپ حاوی ہونے دیں آہستہ آہستہ عمل پذیر ہونے دیں تو شاید زمانہ بدل جائے اور ہم ایک نئی دنیا بسا لیں۔ لیکن مجھے اس قسم روحانی فلسفے سے کوئی سروکار نہیں۔ اور نہ ہی مجھے آج ان " (ISMS) " پر بحث کرنی ہے کہ فلاں چیز اچھی ہے یا بُری میری مرکز نگاہ تو آج تم ہو۔ اور تمہیں بھول کر ان خشک۔ بے جان فلسفوں پر بحث کرنا بے وقوفی ہے۔ شاید مجھے کچھ دن اور زندہ رہنا ہے۔ کیونکہ ایک جوتشی نے چند دن گذرے مجھے بتایا کہ میں جلد مر جاؤں گا۔ میں جوتشی کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا، برسوں سے جھوٹ بولنے سے اس کے خد و خال مسخ ہو گئے تھے۔ چہرے پر ایک قسم کی نحوست برس رہی تھی، اور اس پتھریلی سڑک پر بیٹھے ہوئے نہ جانے اُسے کتنے برس ہو گئے تھے! اور کون جانتا ہے کہ اس نے کتنوں کے ہاتھ دیکھے اور اُن کی قسمت کا جائزہ لیا۔ کتنوں کو اُس نے امیر بنایا، کتنوں کو اُس نے محبوب کے پانے کی امیدیں دلائیں، کتنوں کو اس نے سمندر پار کی سیر کرائی۔ کتنوں کو اس نے ناامیدی کے کنوئیں میں دھکیلا۔ اور کتنوں کو اس نے اس ناامیدی کو سر کرنے کی ترکیبیں

بنا ہیں۔ لیکن سڑک پر گذرنے والوں نے کبھی یہ نہ سوچا کہ وہ کیوں بیس سال سے اس خاک آلود سڑک پر بیٹھا ہوا ہے۔ جہاں گندگی اور غلاظت کے انبار لگے ہوتے ہیں۔ اور پیشاب کی بو سے پھیپھڑے جھلس جاتے ہیں کیا ان بیس سال میں اس کی قسمت کا ستارہ کبھی بلند نہ ہوا۔ کیا وہ ترکیبیں تجویزیں جو وہ دوسروں کو بتاتا تھا کبھی اس نے اپنے اوپر نہیں آزمائیں کیوں یہ پتھریلی زمین اس کی بنجر زندگی کا ایک اہم جزو بن گئی۔ کیا یہ سڑک یوں ہی پتھریلی رہے گی اور اس پر چلنے والوں کا ستارہ کبھی بلند نہ ہوگا۔ میں نے چاہا کہ اس جوتشی کو کھری کھری سناؤں اور اُسے کہہ دوں، کہ وہ کیوں جھوٹ بول کر اپنی روح کو گندہ بنا تا رہا ہے۔ لیکن زندگی میں صرف روح ہی ہوتی تو میں اُس سے یہ بات پوچھ لیتا۔ لیکن زندگی میں روح کے علاوہ پیٹ بھی ہے۔ جو روح سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ روحانی تسلی کو خیرباد کہا جاسکتا ہے لیکن پیٹ کی بھوک کو خیرباد کہنا مشکل ہے۔

مگر تمہیں ان جوتشیوں اور راہ گیروں سے کیا واسطہ، یہ لوگ تو اِن انسانوں کے لئے وقف ہیں جنہیں اور کوئی کام نہیں ہوتا۔ تمہیں تو اُس زندگی سے بہت سے کام لینے ہیں، اور ایک کام یہ بھی کرنا ہے کہ تمہیں میرا یہ بے سرو پا خط بھی پڑھنا ہے۔ یہ ایک نہایت احمقانہ بات ہے کہ قصّہ تو محبت کا شروع ہوا، اور میں پیٹ کا قصہ لے بیٹھا۔ دراصل یہ دونوں چیزیں ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ ان دونوں پر انسانی زندگی

کا دارومدار ہے، اگر انسانی زندگی کا دارومدار نہیں۔ تو کم از کم میری زندگی کا انحصار انہی دو چیز دل پر ہے۔ اگر میں تمہیں اپنا نہ بنا سکا تو اسمیں تمہاری محبت کا قصور نہیں بلکہ ان حالات کا جن پر میں قابو نہ پاسکا۔ اور اگر حالات پر قابو پا لیتا تو شاید تم آج میری آغوش میں ہوتیں، اور مجھے یہ خط لکھنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑتی۔

میں نے تمہیں پہلی بار اس وقت دیکھا۔ جب تم پانچویں جماعت میں پڑھتی تھیں، یوں ہی تم ایک دن میرے کمرے میں آگئیں۔ یونہی نہیں، بلکہ تمہیں ایک کام تھا، اس وقت گو تمہارا قد چھوٹا سا تھا۔ پتلا سا جسم اور خد و خال نہایت تیکھے۔ تمہارے خد و خال نے مجھے بالکل نہیں اُکسایا۔ بلکہ اس بے باکی۔ اس بے تکلفی نے جو تم نے میرے سامنے برتی تم نے بغیر کسی جھجک کے کہہ دیا "کہ بہن جی انگلش ریڈر مانگتی ہیں"۔ میں تمہاری صورت کا جائزہ لے رہا تھا تم نے خود ہی الماری کھول لی اور کتاب تلاش کرنے لگیں۔ میں تمہاری بے باکی پر اور بھی حیران ہوا۔ تمہارے سر سے دوپٹہ سرک گیا تھا۔ اور تمہارے سیاہ بال میری نظروں میں الجھتے گئے۔ اس دن مجھے تمہارے بال اچھے لگے۔ کتنے سیاہ اور لمبے تھے۔ تم نے جلد ہی کتاب ڈھونڈھ لی۔ اور پھر چلی گئیں، یہ تھی پہلی ملاقات، کتنی بے جان بے لذت اور فروعی، جس کا ذکر کرنا نہایت فضول معلوم ہوتا ہے۔ صرف ایک لفظ میں اس ملاقات کے اثر کو بیان کیا جاسکتا

ہے۔ اور وہ یہ کہ تم اس دن نہایت بے باک تھیں۔ اور تمہارے بال سیاہ اور لمبے تھے، اور دو سال کے بعد جب تم مجھے ملیں تو میں تمہیں پہچان نہ سکا۔ ان دو سال میں تم کیا سے کیا ہو گئی تھیں۔ اس دن مجھے تمہارے بال اچھے لگے تھے، آج تمہارا قد ہینج کی طرح لانبا، اور نازک اندام میں نے سرو سے اس لئے تشبیہہ نہیں دی۔ کہ یہ تشبیہہ پرانی ہو چکی۔ اور زیادہ استعمال سے اس لفظ کی خوبصورتی مٹ چکی ہے۔ ہینج کا درخت تم نے نہیں دیکھا ہوگا۔ کیونکہ شہروں میں۔ ہینج کے درخت نہیں ہوتے سرو بہت ہوتے ہیں اور میں تمہارے تصور کو بہت دور لے جانا چاہتا ہوں تاکہ اس شادی کے ماحول سے نکل کر تم چند ساعتوں کے لئے اس دنیا میں آجاؤ۔ جہاں میں سانس لے رہا ہوں۔ تاکہ تم بھی میری طرح ماضی کے واقعات سے لطف اندوز ہو سکو۔ تم اگر اکیلی ہوتیں تو میں تمہیں زیادہ نہاک سے دیکھتا اور ایک نقاش کی حیثیت سے تمہارے خد و خال کا جائزہ لیتا لیکن تمہارے ساتھ ایک اور بھی لڑکی تھی۔ جس کا حسن آج تمہاری موہنی پہ حاوی ہو رہا تھا۔ اس کا کھلا ہوا چہرہ، غلافی آنکھیں اور رس بھرے ہونٹ تمہارے لمبوترے چہرے اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں اور پتلے پتلے ہونٹوں کے مقابلے میں زیادہ اچھے لگے۔ تم اس دن شرم وحیا سے سمٹی ہوئی تھیں۔ اور وہ زیادہ بے باک نظر آرہی تھی، اسے اپنے جسمانی حسن کا احساس تھا۔ اسی لئے وہ اٹھلا اٹھلا کر چلتی تھی۔

اور اس کا ابھرا ہوا سینہ مجھے زیادہ پسند آیا۔ جس میں شباب

کی ساری تازگی پنہاں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جوانی ایک سیلِ آتشیں کی صورت میں ان بلندیوں کے نیچے کروٹیں لے رہی ہے۔ اور یکایک اس دن مجھے معلوم ہوا کہ اس مشینی دور میں بھی عورت کا شباب زندہ ہے۔ ازل سے لے کر ابد تک، اس شباب میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ انسانوں کی حرکات، سکنات، ان کا نصب العین، ان کی معاشرت، اُن کی اخلاقی، سیاسی قدریں بدلتی رہی ہیں۔ لیکن عورت کا شباب اسی شدت سے محسوس کیا جاتا ہے، صدیوں کا آہنی چکر شباب کی رعنائیوں، لطافتوں اور کیفیتوں کو نہیں کچل سکا۔ اب بھی بیسویں صدی میں ایک مرد ایک عورت کے لئے پاگل ہو سکتا ہے، ایک عورت کے لئے تخت و تاج چھوڑ سکتا ہے،

لیکن تمہاری سہیلی کو اس بات کا احساس نہ تھا، کہ اس کا حسن اتنے تباہ کن نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ وہ ایسے چلتی تھی گویا اُسے لوگوں کی کوئی خاص پروا نہ تھی، اگر لوگوں کی نظریں اُس کے سینے پر پڑتی تھیں۔ تو پڑتی رہیں، اور اگر اس کا کہ نا ضرورت سے زیادہ ابھرا ہوا ہے۔ تو اس میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ اور تم ——— تمہارا قد لمبا تھا۔ اور جسم پتلا سا ترناری کی بیل کی طرح لچکتا ہوا۔ اور پھر تم کچھ حد سے زیادہ شرمیلی ہو گئی تھیں۔ تمہارے چلنے کا انداز نہایت ہی بھدا تھا، گردن نیچے کر کے، کبھی کبھی مڑ کر دیکھنا کبھی چھپ کر کنکھیوں سے، کبھی لبوں پر مسکراہٹ ہے تو کبھی لب جامد ہیں۔ کبھی تمہارا سر ملتا تھا تو کبھی ہاتھ اور

اپنی سہیلی کے ساتھ کھسر پھسر کرنا، اور اس کے ساتھ لپٹ لپٹ کے چلنا مجھے اچھا معلوم نہیں ہوا، اور جب تم گلی کے موڑ پہ پہنچیں تو تم نے مجھے ہاتھ سے نمستے کی مجھے امید تھی کہ تم اس طرح کرو گی۔ تم ایسی لڑکیاں نہایت ہی جذباتی ہوتی ہیں۔ تم پوچھ سکتی ہو کہ مجھے کیونکر معلوم ہوا کہ تم ایسا ہی کرو گی محض تجربے کی بنا پر مجھے معلوم ہے جو لڑکی زیادہ سنجیدہ اور خاموش ہوتی ہے۔ وہ اکثر تصوّر کی دنیا میں ڈوبی رہتی ہے۔ اُسے خود نمائی کی زیادہ ضرورت نہیں ہوتی، اس کے خیالات زیادہ حسین اور رنگین ہوتے ہیں۔ لیکن جو لڑکی زیادہ ہنستی ہے، جسے اپنے حسن کا ضرورت سے زیادہ احساس ہوتا ہے، وہ جذباتی کم ہوتی ہے۔ اور کاروباری زیادہ۔ ایسی لڑکیاں اشارے کم کیا کرتی ہیں۔ خط کم لکھتی ہیں۔ شاید وہ سمجھ جاتی ہیں کہ آخر انہیں ایک دن شادی کرنی ہے تو پھر ان جھنجھٹوں سے کیا حاصل۔ ان اشاروں اور خطوں سے کیا ملے گا۔ چھپ چھپ کر ملنا۔ مڑ مڑ کر دیکھنا نگاہوں سے مسکرانا۔ ایسی باتیں انہیں فضول لگتی ہیں۔ وہ جی بھر کے ہنس لیتی ہیں، وہ مردوں سے کم ڈرتی ہیں۔ اور شرم۔ ڈر۔ اور جھجک کے غلاف کی پناہ نہیں لیتیں۔ اُن کی جنس کا اظہار اُن کی خود نمائی میں ہوتا ہے۔ اور شاید یہ طریقہ دوسرے طریقوں سے بہتر ہے۔ لو ——— میں پھر نفسیاتی چکّر میں اُلجھ گیا۔ مجھے اس سے کیا۔ کہ فلاں عورت جذباتی ہے فلاں نمائش پرست ہے۔ یا فلاں عورت ایسی ہو سکتی ہے یا ہو جائے گی۔ ان باتوں کے لئے میرے پاس وقت نہیں تو ہاں! اس ملاقات کے بعد

تمہاری عادات بدل گئیں، مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے تم نے اپنے آپ کو اور زیادہ سکیڑ لیا ہے۔ بالکل لاجونتی کی بیل کے پتوں کی طرح، جو ذرا سے لمس سے سکڑ جاتے ہیں۔ اگرچہ تمہارا قد لمبا ہوتا جا رہا تھا۔ اور تمہاری آنکھوں میں ایک نئی چمک پیدا ہو رہی تھی لیکن تم ضرورت سے زیادہ گھٹی گھٹی نظر آنے لگیں۔ ایسا معلوم ہوتا کہ تمہارے ذہن پر ایک بوجھ سا ہے۔ جس کا احساس تمہیں نہایت شدّت سے ہو رہا ہے۔ مجھے کیا معلوم کہ گھر والوں کے ساتھ تمہارا کیا رویّہ تھا۔ شاید تم گھر میں ہنستی ہو گی۔ کھل کر باتیں کرتی ہو گی۔ لیکن میں کامل وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس ملاقات کے بعد جب بھی تم مجھے گلی میں ملیں تو تم مجھے دیکھ کر گھبرا گئیں۔ اور پھر مجھے دیکھ کر بھاگ گئیں۔ اور ایک دن میں نے تمہارا تعاقب بھی کیا کہ معلوم کروں۔ تم مجھے دیکھ کر کیوں بھاگتی ہو۔ لیکن کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔ تم نے دو تین بار اس طرح کیا۔ اور میں بہت سر پٹایا کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے۔ تمہاری یہ حرکتیں کیا معنی رکھتی ہیں۔ ان چند مہینوں میں کیا کچھ ہو گیا کہ تم مجھے دیکھ کر ٹھٹھک جاتی یا پھر جلدی سے بھاگ جاتی ہو۔ اور پھر ایک دن عقدہ کھلا۔ جب ماں نے مجھ سے کہا کہ بڑے چودھری کے گھر سے سگائی کے لئے کہہ رہے ہیں۔ تمہاری کیا رائے ہے؟" پھر میں سمجھ گیا تم کیوں جھینپ جاتی ہو۔ اور مجھے دیکھ کر گھبرا جاتی ہو۔ اور میری نظروں سے فوراً اوجھل ہو جاتی ہو۔ تمہارے حسنِ تخیل کی میں داد دیتا ہوں کہ منٹوں ہی منٹوں میں تم مجھے کہاں سے کہاں لے گئیں! ماں نے پھر پوچھا "کہ

تمہاری کیا رائے ہے"۔ ان کا مطلب تھا کہ میں ہاں کہہ لوں۔ میں ان دنوں بی۔ اے فیل ہو چکا تھا۔ اور اپنے چچا کی دکان پہ بیٹھا کرتا تھا، میرے چچا شہر کے مشہور ڈاکٹر تھے، اور ان کی یہ رائے تھی کہ میں بھی اس دکان پر کام کروں۔ اور اسی طرح ڈاکٹری سیکھ لوں، اور پھر اس شہر میں ڈاکٹری کی دکان کھول لوں۔ تجویز کتنی معقول تھی۔ لیکن مجھے بالکل ناپسند تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ مجھے عطائیوں سے نفرت ہے گو میں یہ بات جانتا ہوں کہ اگر میں ڈاکٹری سیکھ لیتا تو اس وقت تک کافی روپے کما لئے ہوتے ڈاکٹر گردھاری لال اور ڈاکٹر تارا سنگھ، دونوں نے میرے سامنے ہی پریکٹس شروع کی دونوں نے ڈاکٹری کا امتحان کہیں سے بھی پاس نہ کیا تھا۔ لیکن جاہل لوگوں کو جاہل تر بنانا کوئی مشکل کام نہیں۔ چند دوائیں ایک چھاتی دیکھنے کا آلہ اور تھرمامیٹر خرید کر انسان ایک مکمل ڈاکٹر بن جاتا ہے اور اس کے بعد وہ مریضوں کو چاہے جہنم میں بھیجے یا جنت میں لیکن مجھے یہ طریقے پسند نہیں ہیں ہر چیز کو مکمل طور پر دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس لئے میں نے ڈاکٹر بننے کا خیال ترک کر دیا۔ لیکن تمہارے والد کا اصرار بڑھتا گیا۔ اور وہ سگائی پہ زور دینے لگے۔ تمہارے پیغام بھی مجھ کو ملتے رہتے تھے۔ اور جو کچھ تم نے اپنے رشتہ دار ہربنس سے کہلوایا، وہ بھی مجھے یاد ہے، ان سے کہو کہ وہ سگائی کر لیں۔ میں اس بے باکی کی داد دیتا ہوں، کہ تم نے مجھے ہمیشہ کے لئے منتخب کر لیا۔ اور تم نے ہر ممکن طریقے سے کوشش کی سگائی ہو جائے

اور آخر یہ باتیں شہر میں پھیل گئیں اور شہریوں کی زبان پر چرچا ہونے لگا۔ اس چھوٹے شہر میں تمہارے والد کا کافی رسوخ تھا۔ اس لیے اس بات نے کافی اہمیت اختیار کر لی اور اکثر دوستوں نے مجھ سے کہا۔ بھئی! سنا ہے تمہاری سگائی ہو گئی ہے! بھئی! خوب ہے، اچھی نبھے گی" میرے دوستوں نے تمہیں اکثر دیکھا ہوگا۔ اور تمہارے حسن کی بے باکیوں نے انہیں پریشان بھی کیا ہوگا۔ اُن کے تعریفی فقرے جو وہ ہم دونوں پر کستے تھے، ان میں اُن کی اپنی جنسی بھوک کا وحشیانہ اظہار تھا۔ اب تم نے ہمارے گھر آنا بند کر دیا۔ کیونکہ ماں نے ہاں کر دی تھی۔ اور تمہیں اس بات کا پورا یقین ہو گیا تھا کہ اب تمہاری شادی اسی گھر میں ہو گی۔ تمہارے پیغام میرے پاس پہنچتے تھے" گھر کا دروازہ ذرا اونچا کرا لو۔ میں روز بروز لمبی ہوتی جا رہی ہوں!" "پرسوں آپ نہایت ہی میلے کپڑے پہنے ہوئے تھے" "آپ کو اچکن اچھی نہیں لگتی۔ آپ کے سر کے بال بہت بڑھے ہوئے تھے۔ کیا شہر میں نائی کوئی نہیں" "آپ نے میری طرف دیکھا نہیں۔ اور میرے قریب سے گذر گئے۔" میں اکثر شام کے چھ بجے گلی والے درخت کے قریب کھڑکی ہوتی ہوں اور اپنی سہیلیوں سے باتیں کرتی ہوں تم بھی اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں سے گذرا کرو" اور اس طرح کئی اور احکام جو میں کبھی نہ بجا لا سکا۔

اس کی بہت سی وجوہ ہیں۔ مجھے کچھ اس قسم کے عشق سے نفرت ہو گئی ہے گو میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے لئے یہ بات نئی تھی۔ بالکل نئی۔ کیونکہ تمہارے جسم کی تشکیل یہ ظاہر کر رہی تھی کہ یہ جوش بالکل نیا ہے۔ یہ ابال شاید پہلا

اُبال ہے۔ اس کی اٹھان ہی نرالی ہوتی ہے۔ اور انسان اس حالت میں اتنا بے قابو ہو جاتا ہے کہ اُسے اونچ نیچ کی پروا نہیں رہتی۔ اگر میری بھی یہ اولیں محبت ہوتی۔ تو شاید میں بھی ایسا ہی کرتا۔ اور ہم دونوں نہ جانے کیا کر بیٹھتے، لیکن میں اس سے پہلے ایک عورت سے محبت کر چکا تھا اور وہ بھی ایک شادی شدہ عورت سے اگرچہ یہ پڑھ کر ہنسو گی کہ ایک مجرد انسان ایک شادی شدہ عورت سے کیونکر محبت کر سکتا ہے۔ تمہاری طرح میرے دوست بھی مجھ پر ہنستے ہیں۔ ہندوستان میں محبت کی قدریں ابھی پرانی ہیں۔ یہاں ایک شادی شدہ عورت کی طرف دیکھنا ایک فعلِ بد سمجھا جاتا ہے۔ سماج کہتا ہے۔ وہ عورت تو دوسرے کی ہو چکی۔ اب تمہارا اس پر کیا حق ہے۔ اب تم اس کی طرف کیوں دیکھتے ہو۔ شادی شدہ عورت کی شخصیت تو ایک شخص کی ملکیت ہو چکی۔ اب تم کیوں جھک مارنے پر تلے ہوئے ہو۔ لیکن یہ سچ ہے کہ مجھے اس عورت سے محبت تھی۔ اور اسکے بعد آج تک کسی اور سے محبت نہ کر سکا۔ اگر تم اس عورت کو دیکھتیں تو اُسے دیکھ کر منہ پھیر لیتیں، وہ خوبصورت نہ تھی، لیکن میں نے اُس سے جی بھر کر محبت کر لی۔ یہ میرے شباب کا اولین عکس تھا۔ جس شدت سے میں نے اس عورت کو چاہا۔ وہ گرمی۔ وہ تڑپ وہ اضطراب میرے جسم، میری روح میں پھر کبھی نہ آسکا۔ یہ ایک لمبی سرگذشت ہے۔ جس کا انجام نہایت بھیانک ہے۔ اس عورت کے لئے میں بہت بدنام ہوا۔ اور اُسے بھی میرے لئے کافی ذلت اٹھانی پڑی۔ پانچ سال ہوئے وہ مر گئی۔ لیکن

اُس کی یاد ابھی تک زندہ ہے۔ اُس کی محبت کی تپش باقی ہے۔ جس سے میں اکثر بے چین ہو جاتا ہوں ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ جس طرح تم اپنے آپ کو میرے لئے پریشان کر رہی ہو۔ اسیطرح میں اپنے آپ کو اس عورت کے پانے کے لئے پریشان کرتا رہا۔ میں تو خیر بامراد رہا۔ مگر تم میرے ہاتھوں کے لمس سے بیگانہ رہیں۔ لیکن محبت اور شادی میں فرق ہے۔ میں اس عورت سے محبت کر سکتا تھا۔ شادی نہیں۔ اور تمہارے ساتھ میں شادی کر سکتا تھا۔ لیکن محبت نہیں۔ میں نے کوشش کی کہ میں تم سے محبت کر سکوں۔ لیکن ایسا نہ کر سکا۔ اکثر تمہارے خدوخال میری آنکھوں کے سامنے آجاتے اور میں نہایت باریکی سے اُن کا تجزیہ کرتا، اور اُن میں طرح طرح کے نقص نکالتا۔ اور سوچتا کہ کیا ہی اچھا ہوتا۔ اگر تمہاری آنکھیں بڑی بڑی ہوتیں۔ اور تمہاری ٹھوڑی ضرورت سے زیادہ لمبی نہ ہوتی، اور اگر تمہارا نچلا ہونٹ ذرا موٹا ہوتا، تو زیادہ خوبصورت ہوتا۔ اور اگر تمہاری آنکھوں کی پلکیں زیادہ گھنی ہوتیں، تو تمہاری آنکھوں کی چمک زیادہ نمایاں ہو جاتی۔ اور پھر تم نہایت بے ڈھنگے پن سے لمبی ہوتی جا رہی تھیں۔ کولھوں اور کمر میں کوئی تناسب نہ تھا، اگر کمر پتلی تھی، تو کولھے متناسب نہ تھے۔ اور باقی جسم پر بھی اتنا گوشت نہ تھا کہ تمہارے اعضاء زیادہ متناسب ہو جاتے۔ اس قسم کے گھناؤنے خیال جو شرافت سے قطعاً کوئی تعلق نہیں رکھتے مجھے ستایا کرتے۔ اس عمل کو روکنا میرے بس میں نہ تھا۔ لیکن ان خامیوں کے باوجود تم میں جاذبیت تھی۔ اتنی جاذبیت کہ

میں تم سے شادی کر سکتا تھا۔ لیکن محبت نہیں، محبت کے لئے کچھ اور چاہیئے
ایک خاص قسم کا حسن، ایک قسم کا ——— کیا کہوں۔
تم تو مجھے پسند تھیں، صرف پسند۔ میں تمہیں پسند کر سکتا تھا اور تمہیں
پسند کرتا ہوں، اور شادی بھی کر لیتا۔ اگر حالات اجازت دیتے۔ ہاں حالات
——— شاید تم ہنس دو۔ اور کہو کہ ہندوستان میں ہر انسان شادی
کر لیتا ہے۔ خواہ اس کے حالات اچھے ہوں یا بُرے۔ شادی تو اُن کے لئے
اتنی ہی ضروری چیز ہے جتنی کہ موت، لیکن زندگی میں موت گوارا نہیں کی
جا سکتی ——— میرے تمام دوستوں نے شادیاں کر لی ہیں۔ گو اُن کے
اقتصادی حالات مجھ سے بہتر نہ تھے، تو کیا میں شادی نہ کر سکتا تھا۔ اب
تو میں نے بی۔ اے بھی کر لیا تھا، اور اگر چاہتا، تو کسی بنک، یا گورنمنٹ
کے کسی محکمہ میں ملازم ہو جاتا۔ اور تمہارے دل کی آرزوؤں کو پورا کر دیتا۔ لیکن
میں ان چیزوں سے بہت گھبراتا ہوں، تمہارے والد نے مجھے سگرٹوں کی
ایجنسی لینے کو کہا تھا کہتے لگے، سگرٹوں کی ایجنسی میں بہت فائدہ ہے۔
گورنمنٹ کی نوکری میں کیا دھرا ہے۔ یہ ایجنسی لے لو۔ اور کام کرتے
جاؤ، ساری دنیا سگریٹ پیتی ہے۔ اور خاص کر اس شہر کے لوگ،
تو سگریٹ اور نسوار کا خوب استعمال کرتے ہیں۔ اور اگر ایجنسی کے
ساتھ نسوار کا ٹھیکہ بھی لے لو۔ تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ چند ہی برس
میں میری طرح ایک عالیشان مکان بنا لو گے، اور لڑکوں اور بچوں کے درمیان
ایک باعزت انسان بن جاؤ گے۔ سگریٹ کی ایجنسی اور ——— نسوار

ـــــــــ ، نسوار سے مجھے نفرت ہے۔ لیکن میں سگریٹ پیتا ہوں اور جب کبھی حد سے زیادہ مغموم ہو جاتا ہوں تو کمرے میں بیٹھ کر سگریٹ کا دھواں فضا میں بکھیرتا رہتا ہوں۔ فضا میں دھواں پھیلتا رہتا ہے۔ بکھرتا رہتا ہے۔ اور میرے پریشان، آوارہ خیالات، دھوئیں کی سفید سفید لہروں میں تحلیل ہوتے رہتے ہیں۔ کچھ اسی طرح مجھے تسکین ہو جاتی ہے۔ یونہی چھوٹی سی فروعی باتوں سے تسکین ہو جاتی ہے۔ نہ جانے کیوں۔ لیکن ایجنسی لینے سے تو رہا۔ نسوار ـــــــ توبہ ـــــــ توبہ۔ مکان بنانے کی خواہش نہیں۔ اور باعزت انسان بننا میں نے کبھی قبول نہ کیا۔ ان دنوں میں خود بھی نہیں جانتا تھا۔ کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ اور کیا کروں گا، ایک بے کیف سی آوارگی، میرے دل و دماغ میں بسی رہتی، کوئی چیز پسند نہ آتی تھی۔ دوکان پر کام کرتے کرتے، تنگ آگیا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ شہر چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔ آخر میں کیا چاہتا ہوں۔ اس کے متعلق میں سوچتا رہتا۔ کاش میں کہیں کلرک ہی بھرتی ہو گیا ہوتا۔ اور ساٹھ روپے ماہوار لے کر تم سے شادی کر لی ہوتی۔ اور ان چھ سالوں میں کم از کم چھ بچے پیدا کئے ہوتے۔ شاید مجھے تسکین ہوتی۔ اور لوگوں سے کہہ سکتا کہ میں نے بھی دنیا میں کچھ کام کیا ہے۔ آخر میں اپنے دوستوں کے نقش قدم پر کیوں نہ چلوں۔ اگر انہیں حق حاصل ہے کہ وہ ہر سال ہندوستان کی آبادی میں ایک فرد کا بغیر سوچے سمجھے اضافہ کریں، تو میں کیوں دریا کے کنارے پر کھڑا رہوں، کیوں نہ اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھولوں، لیکن

بیں البیانہ کر سکا۔ اور میں اکثر سوچتا رہتا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ میں کیوں پریشان ہوں اور آہستہ آہستہ مجھ پر یہ بات آشکار ہونے لگی کہ مجھے کلمہ کی سے نفرت ہے، مجھے ان ساٹھ روپوں سے نفرت ہے۔ مجھے ان بچوں سے نفرت ہے۔ مجھے اس گھٹے ہوئے ماحول سے نفرت ہے مجھے ان چھوٹے چھوٹے مکانوں سے نفرت ہے۔ مجھے انسانوں کی کمینگی سے نفرت ہے یہ کیوں ہر طرف غلاظت ہی غلاظت نظر آتی ہے۔ کیوں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہوتا ہے۔ چھتوں پر اندھیرا۔ برتنوں پر اندھیرا۔ چولھے پر اندھیرا۔ روٹیوں پر اندھیرا۔ اور آہستہ آہستہ یہ اندھیرا پھیلتا جاتا ہے۔ کائنات کے ذرّے ذرّے پر چھائے جاتا ہے۔ انسان کے ریشے ریشے میں سمائے جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ مجھے اس نظام سے نفرت ہونے لگی، جہاں اس قسم کا اندھیرا پھیلا رہتا ہے، کیوں نہ میں اس اندھیرے کو چیر دوں اس اندھیرے کی قبا کو پھاڑ دوں، تاکہ روشنی کا منبع اعظم پھوٹ پڑے کم از کم ان چھوٹے مکانوں میں روشنی تو آجائے۔ ان چھوٹے کمروں میں جہاں ایک جگہ میاں بیوی اور بچے ہوتے ہیں چمک آجائے جہاں مہینے میں ساٹھ روپے ملتے ہیں۔ اور کھانے والے افراد آٹھ ہوتے ہیں۔ جہاں شادی کے بعد عورتیں جلد بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ جہاں اُن کی آنکھوں کی چمک بہت جلدی غائب ہو جاتی ہے۔ اور اُن کی ملائم مخروطی انگلیاں برتن صاف کرتے کرتے ٹیڑھی ٹیڑھی ہو جاتی ہیں، جہاں اُن کے چہرے کی ہڈیاں باہر نکل آتی ہیں۔ اور ہڈیوں پر چمڑا اتنا سخت اور کھُردرا ہو جاتا ہے کہ دیکھنے کو جی نہیں

چاہتا۔ جہاں اُن کے گالوں کے گڑھے اتنے گہرے ہو جاتے ہیں کہ ان میں چلنسی بھوک کسی بھٹکی ہوئی چمگادڑ کی طرح کراہتی رہتی ہے۔ وہ سیاہ بال جن پر اس کا خاوند جان چھڑکتا تھا۔ آج کیوں بوٹ پالش کے برش کی طرح خشک اور کھردرے ہو گئے ہیں۔ آنکھوں کی تابانی کہاں گئی۔ وہ میٹھی شہد جیسی آواز کدھر غائب ہو گئی۔ اور انسان کیوں گنوار اور حیوان بن جاتے ہیں۔ بے روح۔ صرف چلتی پھرتی ٹانگیں اور ان پر کپڑوں کے خول۔ اور اندر کچھ بھی نہیں دکھائی نہ دینے والا انسان۔ اور آہستہ آہستہ یہ حقیقتیں میرے لئے بارگراں ہو گئیں۔ دل میں اس نظام کے خلاف ایک نفرت کا جذبہ بھڑکنے لگا۔ لیکن اس دوران میں چند لمحے ایسے بھی آئے کہ میں اپنے آپ کو کوسنے لگتا۔ تمہاری یاد کا جال آہستہ آہستہ مضبوط ہو رہا تھا۔ اور اس شہر میں رہتے ہوئے یہ ناممکن تھا کہ میں تمہیں بھول جاتا یا نظر انداز کر دیتا۔ تمہاری باتیں اکثر مجھ تک پہنچتیں تم اکثر مجھے کہیں نہ کہیں مل جاتیں۔ کبھی کبھی اپنے نوکر کے ساتھ کبھی سہیلیوں کے ساتھ۔ اور کبھی اپنی اماں کے ساتھ۔ تمہاری آنکھوں کا حزن و ملال تمہاری نگاہوں کی ذراسی جنبش مجھے کبھی کبھی پریشان کر دیتی۔ اور پھر تمہارے والد نے کچھ عرصے سے مختلف تحائف ہمارے گھر بھیجنا شروع کر دیئے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ سگائی کی بات پکی ہو گئی لیکن میں جانتا تھا کہ یہ کام ہونے والا نہیں۔ گھر والے اکثر مجھے نوکری کے لئے مجبور کرتے۔ لیکن میں گھر والوں کو یہ کہہ کر ٹال دیتا، کہ نوکری اچھی ملتی نہیں اور اس طرح آنے والے خطرے کو ٹالتا رہتا۔ آخر تمہارے والدین نے

تنگ آکر مجھ سے پوچھ ہی لیا" کہ میری کیا رائے ہے" کب تک شادی کرنے کا ارادہ ہے"۔ پہلے پہل میں نے سوچا کہ میں اُنہیں گول مول جواب دے دوں۔ کیونکہ میں تم سے رشتہ ناطہ توڑنا نہ چاہتا تھا۔ کون چاہتا ہے کہ اس سنہری جال کو توڑ دیا جائے۔ جس میں آرزوؤں۔ تمناؤں اور خواہشوں کا تانا بانا لگا رہتا ہے۔ کم از کم میں تو نہیں چاہتا تھا کہ تم میرا کورا جواب سنکر مجھ سے روٹھ جاؤ۔ اور میں تمہاری مسکراہٹوں سے اتنی جلدی محروم ہو جاؤں۔ تمہاری نگاہوں کی نوازش سے محظوظ نہ ہو سکوں تمھاری باتیں اکثر مجھ تک پہنچ جاتی تھیں۔ جن سے میرے جذبۂ مردانگی کو کچھ تقویت ملتی تھی۔ لیکن میں یہ بھی نہ چاہتا تھا کہ تمہارے والدین کو ہمیشہ کے لئے تاریکی میں رکھوں اگر میں شادی نہیں کرنا چاہتا تو کم از کم ہندوستان میں اور نوجوان موجود ہیں۔ جو تمہارے لبوں کو چومنے کے لئے بے قرار ہیں۔ اس لئے میں نے تمہارے والد سے صاف صاف کہہ دیا کہ "جب تک میں اپنے لئے کوئی اچھا سا کام نہ تلاش کر لوں شادی نہیں کروں گا۔ تمہارے والد نے کہا شادی کر لو۔ اور شادی کے بعد لڑکی ہمارے گھر رہے گی اور جب تک تم کسی اچھے عہدے پر فائز نہیں ہوتے، لڑکی کے اخراجات کے ہم ذمہ دار ہوں گے"۔ تجویز کتنی معقول تھی کہ خرچ تو تمہارے والد کریں۔ اور بچے میں پیدا کرتا جاؤں۔ لیکن یہ کب تک ہو سکتا تھا۔ آخر ایک نہ ایک دن مجھے اپنے بچوں کا باعزت باپ بننا پڑے گا۔ میرا ضمیر اس ذلت کو برداشت نہ کر سکا۔ کیونکہ اس نظام میں ایک اچھی جگہ حاصل

کرنا ایک مہم سر کرنا ہے اور چونکہ میں نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہوں اور طبقاتی کشمکش کی بہیمیت اور شقاوت ہر روز بڑھتی چلی جا رہی ہے ہر ایک شخص دوسرے کا گلا گھونٹنے کے لئے تیار ہے۔ اور اگر متوسط طبقے کا کوئی فرد اس خلیج کو پاٹنا چاہے، یا یہ کوشش ہی کرے، تو اُس کے ساتھی ہی اُس کی ٹانگ کھینچتے ہیں۔ اور عرشی طبقے والے لوگ کب یہ گوارا کرتے ہیں کہ کوئی زمینی آدمی اُن کے محلوں میں قدم رکھ سکے، اور اس کرب انگیز کشمکش میں وہ انسان نہیں رہتا۔ ایک بے روح۔ بے جان لوتھڑ بن جاتا ہے۔ اور مجھے تو اس روشنی کے مینار کو پانے کے لئے کافی جدوجہد کرنی تھی۔ میرے پاس کسی بڑے آدمی کی سفارش نہ تھی۔ رشوت اور تحفوں کے لئے انثار و پیہ نہ تھا —————— اور انگلینڈ سے کوئی ڈگری لے کر بھی نہ آیا تھا۔ کوئی رشتہ دار کسی اعلیٰ عہدے پر فائز نہ تھا تو ان حالات میں میں کس طرح ایک اچھی جگہ حاصل کر سکتا تھا۔ صرف کلرکی اپنا منہ کھول رہی تھی۔ اور وہ بھی ساٹھ روپوں کی کلرکی، جو آجکل جنگ کے زمانے میں ٹکے سیر بکنے لگی ہے، اور پھر ہر پڑھا لکھا نوجوان کلرک بن کر اپنے آپ کو افلاطون سمجھتا ہے۔ اور بچے پیدا کرنے سے ذرا نہیں جھجکتا، اور کبھی کبھی تمہاری سنہری آرزوؤں کا جال میرے قریب آ جاتا تو میرے صبر کے بند ٹوٹ جاتے اور میں سوچتا کہ مجھے کیا غرض ہے کہ میں اپنے آپ کو یوں برباد کروں۔ ازل سے لے کر ابد تک یہ اندھیرا چھایا ہوا ہے اور آج تک کوئی شخص اس اندھیرے کو دور نہ کر سکا بلکہ یہ اندھیرا دن بدن زیادہ

گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ اور میں اس روشنی کے مینار کو پانے کی بے سود کوشش کر رہا ہوں۔ کیوں نہ میں اپنے آپ کو اس اندھیرے کے وسیع اور بے پایاں سمندر میں پھینک دوں اور ہمیشہ کے لئے اس میں غرق ہو جاؤں، اور پھر اس اندھیرے میں تمہارے ہونٹ چمکنے لگتے۔ تمہارے گال تمتمانے لگتے۔ تمہارے لانبے لانبے بال سر سے لے کر پاؤں تک چھا جاتے۔ تمہاری آنکھوں میں سنہری آرزوئیں ناچنے لگتیں۔ اور میں تمہیں پکڑنے کی کوشش کرتا، تاکہ تمہارے سیاہ بالوں میں اپنے آپ کو چھپا لوں۔ اور تمہاری آتشیں خواہشیں مجھے چاروں طرف سے گھیر لیں، اور ہم دونوں اس اندھیرے سمندر میں باقی انسانوں کی طرح لڑھکتے رہیں۔ کم از کم تمہارے ہونٹوں کا لمس مجھے ہمیشہ کے لئے ان اقتصادی جھنجھٹوں سے آزاد کر دے گا۔ لیکن میں نے سگرٹوں کی ایجنسی لے کر شادی کرنا گوارا نہ کیا،

——— جاہل!

شاید مجھے عام انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنے کی کبھی آرزو نہیں ہوئی بلکہ مجھے ان لوگوں سے نفرت سی ہو گئی ہے۔ اور اس طرز بود و ماند سے۔ اس معاشرت سے۔ اس تہذیب و تمدن سے، میں روشنی کے مینار کو پانا چاہتا ہوں اور اس کی نورانی کرنوں کو دنیا میں بکھیرنا چاہتا ہوں، تاکہ اس پھیلے ہوئے بے پایاں اندھیرے میں کچھ کمی ہو جائے۔ لیکن آخر ک روشنی کے مینار کو کون پا سکا ہے۔ یہ سرمایہ دار قومیں۔ ہمیں اس روشنی کے مینار کے نزدیک پھٹکنے نہیں دیتیں۔ میں

یونہی اس بحث میں پڑ گیا۔ جیسے لوگ سرمایہ دار نظام کو نہیں سمجھتے۔ ان باتوں سے کچھ بنتا ہے ناحق میں اپنے دماغ کو پریشان کر رہا ہوں۔ اب تم شوہر والی ہو، ایک بچے کی ماں ہو۔ اور تمہارا گھر ہے .... اور معلوم نہیں۔ تم کیا ہو۔ اور کیا ہو جاؤ گی۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارا شوہر لوہے کا بیوپار کرتا ہے۔ آجکل لوہے کی اشد ضرورت ہے اور لوہے کی قیمت تو سونے کے برابر ہے۔ آجکل تمہاری چاندی ہے۔ کہاں سرمایہ دار نظام کی باتیں۔ اور کہاں لوہا اور سونا۔ دراصل ہماری ذہنیت بھی سرمایہ دارانہ ہو گئی ہے۔ ہم خطوں میں بھی ان چیزوں کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ تم جانتی بھی ہو۔ تم نے میرا انتظار کیا۔ ایک سال دو سال۔ تین سال۔ شاید کہیں نوکری مل جائے۔ لیکن میں نوکری کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے نوکری کہاں ملتی۔ آخر تمہارے والدین نے تنگ آ کر تمہارے لئے پھر در کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ اور میں اس دوران میں تمہارے طعنے سنتا رہا۔ اور آخر تم کب تک میرا انتظار کرتیں۔ ہر مرد ایک آسودہ زندگی گزارنا چاہتا ہے، تو پھر تمہیں بھی حق تھا کہ تم اپنے رویے کو بدل دیتیں۔ اور اپنی زندگی ایک نئے قالب میں ڈھالتیں۔ اور پھر ایک دن تمہاری برات آ گئی۔ میں اس دن اسی شہر میں تھا۔ تمہارے والد نے مجھے مدعو نہ کیا۔ شاید یہ ناراضگی کا اظہار تھا کہ میں نے کیوں شہر کے ایک بڑے آدمی کی بات نہ رکھی۔ اور ناطہ توڑ دیا۔ تم جس طرح مجھے بھول گئیں میں اس کی تعریف کرتا ہوں۔ اور جس خوشی سے تم نے اپنے خاوند کے گلے

میں ہار ڈالا۔ اس کی بھی داد دیتا ہوں۔ تمہاری سہیلیوں نے مجھے بتایا کہ تم بہت خوش تھیں۔ یہ باتیں سُن کر مجھ کو صدمہ ہوا۔ لیکن تمہاری اس نئی روش نے مجھے ذہنی تقویت بھی دی۔ زندگی کے ایک نئے زاویئے سے آگاہ کر دیا۔

تم نے میری یاد کو دل و دماغ سے اس طرح خارج کر دیا جس طرح ایک نئی دُلہن شادی کے چند مہینوں بعد اپنا لال جوڑا اتار پھینکتی ہے مجھے معلوم ہے۔ تم ہنستی کھیلتی اپنے خاوند کے ساتھ چلی گئیں تم مجھے پیرپور کے اڈے پہ ملیں۔ جب تم گونے کے بعد واپس آ رہی تھیں تمہارا خاوند تمہارے ساتھ تھا۔ وہ کچھ وجیہہ نہ تھا یہ محسوس کر کے مجھے خوشی ہوئی کم از کم وہ مجھ سے زیادہ خوش شکل نہ تھا۔ بلکہ میں تو نہایت فراخدلی سے اسے بھدا کہہ سکتا ہوں۔ لیکن تم خوش تھیں تم نے ایک نہایت قیمتی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ جس کا روپہلی کنارہ تمہارے سیاہ بالوں کو چوم رہا تھا، تمہارے چہرے کا صرف ایک حصّہ مجھے دکھائی دیتا تھا۔ اس لئے میں تمہاری خوشی اور انبساط کا پورا اندازہ نہ کر سکا۔ تم نے مجھے دیکھکر آنکھیں پھیر لیں۔ اور جوار کے لہلہاتے کھیتوں کی طرف دیکھنے لگیں اور پھر لاری چل پڑی، تم نے شادی کر کے اس گھریلو زندگی کو اچھی طرح دیکھ لیا ہوگا۔ یہ زندگی کوئی اتنی اچھی نہیں اس میں کوئی خاص جاذبیت نہیں۔ ساس اور نند کے جھگڑے۔ ساس اور بہو کے جھگڑے۔ خاوند اور بیوی کے جھگڑے اور پھر اقتصادی جھگڑے۔ مزاج کی ناموافقت اور طرح طرح کی چھوٹی چھوٹی

باتوں سے زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ لیکن تم ایک ہندوستانی عورت ہو اور ہندوستانی عورت کے لئے شادی ہی زندگی کا سب سے بڑا عطیہ ہے اور اسی لئے تم نے اس زندگی کو اپنا لیا ہوگا۔ نہیں تو۔ اس کے سوا اور کیا چارہ ہے۔

میں ابھی تک اکیلا ہوں، بالکل اکیلا اور تنہا، دن رات روشنی کا مینار میری آنکھوں کے سامنے ناچتا رہتا ہے پر میں اُسے چھو نہیں سکتا۔ اس تنہائی میں تم کبھی کبھی یاد آجاتی ہو، صرف تم ہی نہیں بلکہ کچھ اور عورتیں بھی جن سے میں محبت کر چکا ہوں، اب ان سب کی یاد معدوم ہوتی جا رہی ہے، اور اب یہ حالت ہے، کہ نہ تو میں محبت کر سکتا ہوں، اور نہ شادی اب صرف ایک جسم سے پیار کر سکتا ہوں۔ جہاں میں آجکل رہتا ہوں، وہ جگہ شہر سے الگ تھلگ ہے۔ اس کے باوجود اسجگہ میں اتنی کشش ہے کہ بیان نہیں کی جا سکتی، شاید اس جگہ میں اتنی کشش اور جاذبیت نہ ہوتی اگر سامنے والی کوٹھی میں ایک لڑکی نہ رہتی ہوتی۔ جس کا میں ذکر کرنے والا ہوں۔ ہمارے پڑوسی نہایت امیر و کبیر ہیں ایک عالی شان کوٹھی میں رہتے ہیں۔ باہر ہمیشہ کاریں کھڑی رہتی ہیں، لیکن مجھے ان کاروں اور عالیشان کوٹھیوں سے دلچسپی نہیں۔ بلکہ ایک لڑکی سے ہے۔ جو اس کوٹھی میں رہتی ہے۔ میں نے آجتک ایسی حسین و جمیل لڑکی کہیں نہیں دیکھی۔ یہ لڑکی نہیں بلکہ ایک مکمل عورت ہے۔ عورت اور لڑکی میں فرق ہوتا ہے بس وہی فرق۔ جب تک تمہاری شادی نہ ہوئی تھی، تم لڑکی تھیں

جب تم نے شادی کر لی۔ تم عورت بن گئیں۔ لیکن ہماری پڑوسن شادی کے بغیر ایک مکمل عورت ہے۔ یہ ایک بیسویں صدی کا معمہ ہے۔ جسے تم حل نہ کر سکو گی۔ تمہاری آنے والی نسلیں اس معمہ کا جواب ہوں گی۔

ایک دن وہ مجھے بس میں مل گئی۔ جس حقارت سے اُس نے میری طرف دیکھا وہ آج تک میرے سینے میں بچھو کے ڈنک کی طرح رینگ رہی ہے۔ اس نے یوں ہی سرسری نظر سے میرے کپڑوں کا جائزہ لیا۔ جیسے میری روح کپڑوں میں مقید ہے اور میرا جسم ایک بے جان شے ہے۔ وہ میری سُرخ نکٹائی دیکھ کر مسکرائی۔ جس کی گرہ زیادہ استعمال کی وجہ سے میلی ہو گئی تھی۔ پھر اس کی نظر میرے ہیٹ کی طرف گئی۔ جس کا اوپر والا حصّہ کافی دبا ہُوا تھا۔ میں نے پتلون کی کریز کو درست کیا۔ لیکن میرے بوٹ جن پر دو ماہ سے پالش نہ ہُوا تھا۔ میری سراسیمگی پر خشمگیں ہو گئے! اس دن میں نے جرابیں بھی نہ پہنی تھیں دراصل میں جرابیں پہنتا ہی نہیں۔ اُس دن مجھے اپنے جمالیاتی مذاق پر بہت غصّہ آیا۔ پتلون کے نچلے حصّے اور بوٹوں کے درمیان میری ٹانگوں کا حصّہ برہنہ تھا۔ جس پر سخت سخت بال اُگے ہوئے تھے۔ بوٹوں کے تسمے میری آوارگی پر ایک قہقہہ لگا رہے تھے۔ شرم سے میں عرق عرق ہو گیا اور ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ میں نے اپنے بھونڈے پن کو چھپانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن مجھ میں اور اس لڑکی میں کافی تفاوت تھا۔ ایک وسیع خلیج حائل تھی۔ اس کو پاٹنا میرے لئے ناممکن تھا۔ اُس خلیج میں کاریں، کوٹھیاں، ڈیزسٹ، نوکر، نوکرانیاں، چاندی کے

سکتے، بنک کے نوٹ۔ خوبصورت عورتیں۔ حریری پردے، وہائٹ ہارس۔ چھری کانٹے سب کچھ تیر رہے تھے اور میں دوسرے کنارے پر کھڑا تھا۔ اسکی اس مسخر آمیز مسکراہٹ کا مطلب سمجھ گیا۔ لیکن اُس کی آنکھیں جن پر وہ ہمیشہ ایک آسمانی رنگ کی عینک چڑھائے رکھتی ہے۔ اصلیت کو چھپا نہ سکیں۔ وہ آنکھیں مغموم تھیں، ان آنکھوں نے دنیا کے خلا کو دیکھ لیا تھا اتنی دولت ہوتے ہوئے اور حسن کی فراوانی کے باوجود یہ آنکھیں بے چین تھیں۔ یہ آنکھیں اداس تھیں ان میں زندگی کی بے حاصلی نمایاں تھی۔ جیسے وہ کسی کا انتظار کرتے کرتے تھک گئیں۔ لیکن اندھی نہ ہو سکیں۔ چاندی کے سکے بہت کچھ کر سکتے ہیں ان سکوں سے خوشی کے لمحے خریدے جا سکتے ہیں۔ شاید اس نے بھی کسی کو چاہا اور اس کی محبت پروان نہ چڑھ سکی۔ لڑکی نے منہ پھیر لیا اور ساتھ والی کرسچین لڑکی سے گفتگو کرنے لگی۔ لڑکی کی آنکھیں افسردہ ہوتی گئیں۔ اس کے دل کی گہرائیوں کا عکس اسکی آنکھوں میں تیر رہا تھا اور آنکھیں صاف کہہ رہی تھیں۔ کیوں جوانی کی امنگوں کو کچلا جائے۔ یہ جوانی کب تک رہے گی۔ یہ دنیا ہر چیز کو بھول جاتی ہے۔ انسان اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔ کیوں نہ اپنے آپ کو ان رنگین پردوں میں چھپایا جائے۔ یہ سنہری تار، یہ تھرکتے ہوئے پاؤں یہ ناچ گھر، آنکھوں میں بیر کا ہلکا ہلکا نشہ ٹانگوں کا تھرکنا اور کسی کے بازو کمر میں حمائل اور ناچنا اور ناچ کر چور ہو جانا۔ کیوں نہ اس زندگی کو اپنا یا جائے لیکن یہ نشہ ہر وقت قائم نہیں رہتا اور ٹوٹ جاتا ہے اور اسکی جگہ افسردگی لے لیتی ہے

کبھی کبھی سوچتا ہوں ۔ مجھے کیا ۔ یہ عورت میرے دائرے سے باہر ہے
میرے حلقے سے باہر ہے ۔ میں کبھی اس کے جسم کو چھو نہیں سکتا ۔ میں کسی
کو پانے کی ناکام کوشش کرتا ہوں ۔ جس کو حاصل کر سکتا تھا ۔ جسکے ہونٹوں
کو چوم سکتا تھا ۔ اسکو دوسرے کے حوالے کر دیا اور آج ایک ایسی عورت
کو پانے کی تمنا رکھتا ہوں جس کے ہونٹ دوسرے انسانوں کے لئے وقف
ہو چکے ہیں ۔ لیکن انسان ہمیشہ اس چیز کو پانے کی کوشش کرتا ہے ۔ جو
اُسے ملتی نہیں ۔ میں اپنی بے وقوفی پر ہنستا ہوں ۔ اور سوچتا ہوں کہ میں
کیوں اکیلا ہوں ۔ میں کیوں سایوں کے پیچھے بھاگتا رہتا ہوں ۔ میں کیوں کسی
نہ کسی کے جسم کو ہمیشہ کے لئے خرید لوں تاکہ اس نہ ختم ہونے والی افسردگی
اور تنہائی سے رہائی پا سکوں ۔ کیا میں ایسا کر سکوں گا اور اگر کبھی لیا
تو تم نہیں کیا ؟

وہ برآمدے سے نکل کر باہر کھلی فضا میں آگیا۔ گھاس کے خوشے اُس
کے تپتے ہوئے پاؤں کو چھونے لگے۔ اُس کے ہاتھ پاؤں تپتے رہتے تھے۔
اُن میں انگارہ کی سی حدت موجود رہتی تھی، وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں
کو رگڑتا۔ اور پھر اُن تپتے ہوئے ہاتھوں کو گھاس کے خوشوں پر رکھ دیتا
گھاس کی نمی، آہستہ آہستہ اس کی ہتھیلی میں سرایت کرتی، اور وہ ایک قسم لطیف
تسکین سے آشنا ہو جاتا۔ اُس نے تپتے ہوئے پاؤں گھاس پر رکھے۔ تو
نمی اُسکے پاؤں میں سرایت کرتی گئی، اور اُسکے دل و دماغ میں ایک عجیب
سی تسکین اُتر گئی۔ اُس نے چاروں طرف نظر دوڑائی، لیکن تاریکی کے سوا
اُسے کچھ نظر نہ آیا۔ وہ اس پھیلی ہوئی تاریکی کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر

دیکھنے لگا۔ آج تاریکی اس کے ذہن میں ایک عجیب انداز سے پھیل رہی
تھی۔ چاروں طرف نیم جان خاموشی اونگھ رہی تھی، کبھی کبھی سرد ہوا
کا ایک جھونکا آتا۔ اور وہ کھانسنے لگتا۔ بلغم اُسکے سینے میں کھڑکھڑاتی
جیسے موسم خزاں میں سوکھے ہوئے پتے کھڑکھڑاتے ہیں۔ وہ
اکثر اسی جگہ آکر کھڑا ہوتا مکئی کے پھیلے ہوئے کھیتوں کو دیکھا کرتا
اور کچے بھٹوں کی سوندھی خوشبو سے لطف اندوز ہوتا، اُسے اچھی طرح
معلوم تھا۔ کہ چند گز کے فاصلے پر ناشپاتیوں کے درخت ہیں، اور
اُسکے ساتھ ہی آڑو اور سیبوں کے درختوں کی قطاریں بھی، آڑو پک
گئے ہونگے! سیب کسی گلاب کی طرح سرخ ہونگے۔ لیکن آج یہ پھیلی ہوئی
تاریکی خیالات کے ہجوم کو آگے بڑھنے نہ دیتی تھی، تاریکی ایک خوابیدہ
موسیقی کی طرح اُسکے اردگرد لپٹی ہوئی تھی، وہ اس تاریکی کو ہمیشہ کیلئے
خیرباد کہنا چاہتا تھا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کو ملا، تاکہ
شام کے بڑھتے ہوئے سایوں میں وہ اس پھیلے ہوئے منظر کا صحیح طور
پر جائزہ لے سکے۔ لیکن تاریکی کا بڑھتا ہوا طوفان اس منظر کو اپنے آپ
میں سمیٹ رہا تھا۔ اور پھر اُس نے سوچا۔ کہ یہ وہی جگہ ہے، جہاں وہ
سب کچھ ہوا تھا۔ اور اب کچھ نہ ہوگا۔ اُس کی زندگی جو مختلف شاہراہوں
پر گزر رہی تھی آج یکایک ختم ہوگئی ہے، زندگی کی آخری منزل
پر پہنچکر اُسے معلوم ہوا۔ کہ آخیر میں کچھ نہیں رہتا۔ یہ پتھر، یہ لکڑی کے
ٹکڑے، یہ گھاس کے خوشے، یہ سیب اور آڑو کے درخت، یہ پھیلا ہوا

نیلگوں آسمان، یہ اونگھتی ہوئی تاریکی۔ یہ سب کچھ آنکھوں سے اوجھل ہوجائیگا۔ بلکہ ہوتا جارہا تھا۔ کیونکہ اُس کی آنکھوں کی بینائی روز بروز کمزور ہو رہی تھی، اور ایک دن بالکل معدوم ہوجائے گی۔ تو وہ زندہ رہ کر کیا کریگا۔ "میرے پرمیشور" وہ بڑبڑایا۔ وہ دن کبھی نہ آئے، اگر اُس کی آنکھوں کی روشنی بالکل معدوم ہوگئی، تو وہ اِس خاموش، بے حس، بے کیف تاریکی کا حصہ بن جائیگا۔ اُس نے اپنی آنکھوں کو زور زور سے ملا، اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پھیلی ہوئی تاریکی کی طرف دیکھنا چاہا۔ تاریکی اور گہری ہوتی جارہی تھی اور آس پاس کے درخت نظروں سے اوجھل ہو رہے تھے، اُس کا ذہن ایک نئی روشنی سے منور ہو رہا تھا۔ اُسکے دماغ سے تاریکی کا سیاہ پردہ اُٹھ رہا تھا۔ اور ماضی کے واقعات اُس تاریکی میں کسی درخشاں فلم کی طرح اُبھرتے چلے آرہے تھے۔

وہ چار سال کا تھا۔ جب اُس کے سر سے ماں باپ کا سایہ اُٹھ گیا اور وہ ہمیشہ کے لئے ماں باپ کے پیار سے محروم کر دیا گیا۔ جب اُس نے ہوش سنبھالا۔ تو وہ اپنے بڑے بھائی کے گھر میں پرورش پا رہا تھا۔ جب اُس نے دسویں پاس کی۔ تو بڑے بھائی نے اُسے ٹیلرنگ ہاؤس میں بھیجدیا، چند مہینے وہ ٹیلرنگ ہاؤس میں کام سیکھتا رہا۔ مگر اُس کا جی ٹیلرنگ ہاؤس میں نہ لگا۔ اُسے یہ پیشہ شروع سے ہی ناپسند تھا۔ اکثر وہ ٹوٹی پھوٹی مشینوں کو صاف کرتا۔ پرزوں کو تیل دیتا۔ پھٹے ہوئے کپڑوں

کو سینا، اور کبھی کبھی کپڑے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو قینچی سے کاٹتا،
دو تین بار اُس کی انگلی مشین کی سوئی سے کٹ گئی تھی، اور وہ درد
سے چلا اُٹھا تھا، اُس نے چند دن ٹیلرنگ ہاؤس میں رہ کر محسوس کیا
کہ وہ درزی نہیں بن سکتا، اور وہ محسوس کرنے لگا، کہ اُسکے بڑے بھائی
نے اس کی ذہنی قوتوں کا صحیح استعمال نہیں کیا۔ کیا ہی اچھا ہوتا۔ اگر
اُس کا بڑا بھائی اُسے کالج میں داخل کرا دیتا، اُس کا بڑا بھائی کافی کماتا
تھا، کم از کم وہ ایم اے یا بی۔ اے تو کر لیتا، اور کوئی اچھی جگہ حاصل
کرنے کے قابل ہو جاتا کبھی کبھی ٹیلرنگ ہاؤس میں بیٹھے ہوئے اُسے
اپنے ماں باپ کا خیال آتا، تو اُس کی آنکھوں میں نمی سی آجاتی، کاش
وہ زندہ ہوتے، اُس کی اچھی طرح دیکھ بھال کرتے، یہ بڑے بھائی
بڑے سخت دل ہوتے ہیں، اُس کا بڑا بھائی شادی سے پہلے اتنا سخت
دل نہ تھا، وہ شادی سے پہلے کہتا تھا "جب تک میں زندہ ہوں
تمہیں کسی طرح کی تکلیف نہ ہونے دونگا" شادی کے بعد نہ جانے کیا ہوا
کہ بھائی کے تیور ہی بدل گئے۔ نہ وہ برتاؤ رہا۔ نہ وہ باتیں، روز بروز
مزاج چڑچڑا ہوتا گیا، حتیٰ کہ اب ہر بات پر جھگڑا ہونا۔ اور وہ محسوس
کرتا، کہ اُس کا اس گھر میں رہنا درست نہیں، لیکن وہ کدھر جائے،
کہاں جائے، اس کے متعلق وہ کچھ نہ سوچ سکتا، اور وہ خاموش ہو جاتا
لوگوں سے کم ملتا، اُن سے کم باتیں کرتا، اُسے یاد نہ تھا۔ کہ وہ آجتک
کبھی کھلکھلا کر ہنسا تھا، جب کبھی لوگ باتیں کرتے کرتے قہقہے لگاتے، تو

وہ قہقہوں کے جواب میں مسکرا دیتا، اُس مسکراہٹ میں کتنی بے حسی ہوتی تھی، ایک بے کیف، بے جان، مسکراہٹ ——— اس مسکراہٹ کو لبوں پر لانے کے لئے اُسے کتنی ذہنی کوفت اٹھانی پڑتی تھی، جب وہ مسکراتا تو اُسے محسوس ہوتا۔ کہ وہ خون کے گھونٹ پی رہا ہے۔ وہ لوگوں کی باتیں سنتا۔ اور مسکرا دیتا، تاکہ لوگ اُسے بے وقوف نہ تصور کر لیں، اور وہ اس طرح یار دوستوں کی خوشیوں میں اپنے آپ کو شریک کر لیتا۔

ان مسکراہٹوں کے باوجود وہ اپنی حیات میں خاموشی کو غالب دیکھتا۔ اور کبھی کبھی اُسے ایسا محسوس ہوتا۔ کہ یہ خاموشی اُسکے جسم کا ایک حصہ بن گئی ہے، اور اُس کے دل و دماغ پر ایک بھاری بوجھ ہے جس نے اُسکے احساسات کو بالکل کچل دیا ہے، اکثر وہ ایک ہی کمرے میں پڑا رہتا، اُس کا بھائی اُس سے کم گفتگو کرتا، لیکن بھابھی کا برتاؤ اُس سے اچھا تھا، اور وہ اُس سے پوچھتی رہتی، کہ وہ کیوں خاموش رہتا ہے کیا اُسے کوئی تکلیف ہے، کیا اُسے روپے چاہئیں، لیکن وہ ہر بات کا نفی میں جواب دیتا، وہ چاہتا تھا۔ کہ بڑے بھائی سے صاف صاف کہہ دے، کہ وہ درزی نہیں بننا چاہتا اُسے اس پیشہ سے نفرت ہے وہ کالج میں داخل ہونا چاہتا ہے تاکہ بی اے پاس کرے، اور کوئی اچھی جگہ حاصل کر سکے۔ اکثر وہ تہیہ کرتا، کہ وہ آج اپنے بھائی سے صاف کہہ دیگا وہ آج سے ٹیلرنگ ہاؤس نہیں جائے گا۔ لیکن جب اُس کا بھائی گھر آتا

تو وہ بالکل خاموش ہو جاتا، اور یہ خاموشی اُس کے گرد سائیں سائیں کرتی رہتی، اور پھر ایک دن اُس نے تنگ آکر بھابی سے کہہ دیا۔ کہ وہ آج سے ٹیلرنگ ہاؤس نہیں جائے گا۔

بھابی نے حیران کن نظروں سے اُسکی طرف دیکھا۔ اور کہنے لگی۔ تو تم کیا کرنا چاہتے ہو؟

میں ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں۔ اُس نے کہا۔

یہ جواب سنکر بھابھی خاموش ہو گئی۔ اور وہ بھی خاموش ہو گیا۔ چند دنوں کے بعد اُسکے بھائی نے اُس سے کہا کہ وہ ڈاکٹری کے کالج میں داخل ہو سکتا ہے، لیکن اُسے ہوسٹل میں رہنا ہو گا۔ اور صرف چالیس روپے ماہوار ملا کرینگے، اور اگر اس پڑھائی کے دوران میں وہ ایکبار بھی فیل ہو گیا۔ تو پھر دوبارہ کالج میں داخل کرانا اُن کے بس کی بات نہ ہو گی؟"

یہ جواب سنکر وہ کتنا خوش ہوا تھا، وہ چاہتا تھا۔ کہ وہ اپنے بھائی کو گلے سے لگا لے، لیکن بڑے بھائی کے چہرے پر ایک عجیب قسم بڑے پن کا اظہار تھا، جیسے اُس کا بھائی کہہ رہا ہو، کہ تم نے میری زندگی کو اجیرن کر دیا ہے، کیا ہی اچھا ہوتا۔ کہ تم نہ ہوتے، کیا تم نہیں جانتے کہ اس قلیل سی آمدنی سے میں تمہیں کس طرح پڑھا سکتا ہوں، ایک تم ہو کہ ڈاکٹر ہی بننا چاہتے ہو، اب مجھے اپنا خرچ کم کرنا پڑیگا۔ بہت سی تکلیفوں کو سہنا پڑیگا، اور بہت سی باتیں بھی، جو تم نہیں جانتے، اگر

شادی کر لو۔ تو شاید سمجھ سکو"

وہ بھائی کے اس رویہ کو کبھی نہ بھول سکے گا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُس کا بڑا بھائی اُس کے ساتھ ایک دوست کی طرح برتاؤ کرے، ایک دوست کی طرح اُس سے گفتگو کرے، ایک دوست کی طرح اُس کی باتیں مان لے، لیکن یہ چڑچڑا پن کیوں، یہ ہچکچاہٹ کیوں! یہ اُداس سی تلخی کیوں، ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ اس کا بھائی نہیں ہے، جیسے دونوں کا ایک خون نہیں ہے۔ جیسے وہ ایک دوسرے کو بالکل نہیں جانتے۔ اگر دونوں ایک گھر میں اکٹھے ہو گئے ہیں، تو صرف اُن مسافروں کی طرح جو لاری میں اکٹھے سفر کرتے ہیں، اور پھر جلد ہی ایک دوسرے کو بھول جاتے ہیں، وہ زندگی بھر اس رویہ کو نہ بھول سکے گا۔ والدین کے فوت ہونے پر وہ ایک سہارا ڈھونڈنا چاہتا تھا، وہ ایک ایسے آدمی کی تلاش میں تھا، جو اُسے پیار کر سکتا، جو اُسکی بیمار روح کو تسکین دے سکتا، لیکن وہ اس پیار اور شفقت سے ہمیشہ محروم رہا۔

چند دنوں کے بعد وہ کالج میں داخل ہو گیا۔ چھٹیوں میں وہ اکثر گھر آیا کرتا۔ لیکن بڑے بھائی کے برتاؤ میں کوئی فرق نہ آیا۔ بڑے بھائی کے رویہ میں وہی روکھا پن تھا، وہی بڑا پن ——— چار سال ختم ہو گئے اور وہ ڈاکٹر بن گیا۔ اُس نے سوچا۔ کہ اب وہ کمانے کے قابل ہو گیا ہے اب اُس کے بھائی کے رویہ میں کافی فرق آجائے گا۔ اب وہ بھائی کا قرضہ

ادا کر دے گا۔ وہ ایک ایک پائی ادا کر دے گا۔ وہ جانتا تھا۔ کہ اقتصادی وجوہات کی بنا پر اُس کے بھائی کا سلوک اچھا نہ تھا۔ لیکن اب وہ خود کما سکتا تھا۔ اور اپنے بھائی کو کافی مدد دے سکتا تھا۔ لیکن بڑے بھائی نے مدد لینے سے انکار کر دیا۔ رشتہ جوں کا توں رہا۔ خول وہیں کا وہیں رہا۔ زندگی اسیطرح بے کیف رہی، محبت کا جذبہ دن بدن سرد ہوتا گیا۔ اور خاموشی کا ہالہ زیادہ مضبوط ہوتا گیا۔ اکثر وہ اُداس رہتا۔ اور کمرے ہیں اکیلا پڑا رہتا۔ اور تنہائی کی گہرائیوں میں کھو جاتا۔ کچھ دنوں سے اُس کے بڑا بھائی اُس کی شادی کے متعلق سوچ رہا تھا، اور کئی جگہ رشتہ ناطہ کے لئے کوشش کر رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا، کہ شادی کر کے وہ کیا کرے گا، وہ اس المناک تنہائی سے کس طرح چھٹکارا حاصل کر سکے گا، چند دنوں کے بعد معلوم ہوا۔ کہ شادی کی بات "پکی" ہو گئی ہے، اُس نے سوچا۔ شادی کے بعد شاید وہ ہنسی خوشی سے زندگی گذار سکے۔ لیکن اُس کی بیوی کیسی ہو گی اُس کی رنگت کیسی ہوئی، اُس کے خدو خال، اُس کے جسم کے خطوط کیسے ہوں گے ؟ وہ کس گھرانے سے آ رہی ہے، کیا وہ اُسے پسند کر سکے گا، کیا وہ اُس سے محبت کر سکے گی، کیا وہ اُس کی روح کی تنہائیوں میں خوشی کے چند لمحے پھونک سکے گی ! شاید اُس کی بیوی اُس سے محبت کر سکے، وہ آجتک ماں باپ کے پیار سے محروم رہا ہے، بھائی نے اُسے کبھی پیار بھرے لہجے میں نہ پکارا۔ شاید اُسکی ہونے والی بیوی مسرت کے چند لمحے عطا کر سکے۔ اور اسی خیال سے اُس نے

شادی کرلی، بھائی نے اُسے علیحدہ مکان لینے پر مجبور کر دیا، اور اُس نے بھائی کی اس تنگ نظری کو مدِ نظر رکھ کر شہر چھوڑ دیا، اور ایک دور دراز ریاست میں نوکری کرلی، وہ اپنے بھائی کو اتنی جلدی بھلانا نہ چاہتا تھا، وہ اس رشتہ کو قائم رکھنا چاہتا تھا، لیکن چند مہینوں کے بعد اُسے معلوم ہُوا۔ کہ بھائی نے اُس کے خطوں کا جواب دینا چھوڑ دیا ہے، اور شاید ہمیشہ کے لئے اُسے بھلا دیا ہے، اب اُس کی بیوی اُسکے قریب تھی، کیا وہ اپنی بیوی کو چاہتا تھا کیا اُسے اپنی بیوی پسند تھی، شاید پسند اور ناپسند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شادی تو بھائی نے کرائی تھی، انتخاب بڑے بھائی کا تھا، ان باتوں میں اُس کا کوئی دخل نہ تھا گو وہ چاہتا تھا، کہ لڑکی کو دیکھ کر شادی کرے، لیکن بڑے بھائی کے سامنے اُس کی زبان گنگ ہو جاتی تھی، ڈولی میں جو عورت آئی اُس کی بیوی بن گئی، کیا اُس کی بیوی اُس سے محبت کرتی تھی، اسکے متعلق اُسے کوئی علم نہ تھا، شادی ہوتے کتنے ہی برس گذر گئے، اور اسی دوران میں ہر سال ایک بچہ پیدا ہو جاتا، اگر اِس عمل کا نام محبت تھا۔ تو واقعی اُسے اپنی بیوی سے محبت تھی، دراصل اُسے اپنی بیوی بالکل ناپسند تھی، اُسکی بیوی میں کوئی ایسی خوبی نہ تھی۔ جو اُس کے دل کو لبھا سکتی۔ جس سے اُس کے دل کو راحت مل سکتی، گو اُس کی بیوی ایک عورت تھی، اور اُس میں ایک عورت کی تمام خاصیتیں موجود تھیں، یعنی وہ چیزیں جو ایک مرد میں نہیں ہوتیں — اور جس سے ایک عورت —— عورت دکھائی دے سکتی

ہے۔ لیکن ان باتوں کے باوجود وہ اُسے پسند نہ کر سکتا تھا، اُس کی بیوی میں نسائیت نام کو نہ تھی، آواز میں نہ ملائمت نہ پیار۔ یونہی ایک عورت محض ایک عورت ——— اور پھر پسند کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اُسے پسند کرنے کا موقعہ ہی نہیں دیا گیا۔ اس کے باوجود وہ اپنی بیوی سے اختلاط کرتا، اور ہر سال ایک بچہ پیدا کر دیتا، کیا اُسکی بیوی اُس سے محبت کرتی تھی۔؟ اکثر وہ کھانا نہ کھاتی۔ جب تک وہ گھر نہ آتا۔ وہ گھر کا سارا کام کاج کرتی، جھاڑو دیتی، کھانا پکاتی، کپڑے دھوتی، بچوں کو پالتی۔ سب کام کرتی، اکثر وہ کام کرتے کرتے تھک جاتی، لیکن اُس نے کبھی ان باتوں کی شکایت نہ کی، شاید وہ اُسے پاکر خوش تھی، شاید اُسکی زندگی کا یہی مقصد تھا، کہ اُسے ایک ایسا آدمی مل جائے جو بچے پیدا کر سکے، اور ہر مہینے تنخواہ لاکر دے سکے۔ اور اُس کے بعد اُسے کچھ نہ کہے، اُس نے سمجھ لیا۔ کہ ان حالات میں دونوں ایک دوسرے کو سمجھ نہیں سکتے، دونوں ایک دوسرے کو کبھی پہچان نہیں سکتے، اُس کی المناک تنہائی میں کوئی فرق نہ آیا، اکثر اُسے ہسپتال میں اتنا عرصہ کام کرنا پڑتا تھا کہ اُسے ان باتوں کے سوچنے کا کم موقعہ ملتا۔ دونوں اتنا قریب ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے بہت دور تھے۔ بہت دور ——— دونوں کے درمیان ایک خلیج حائل تھی۔ وہی خلیج! جو دونوں بھائیوں کے درمیان تھی، دونوں ایک دوسرے کو سمجھنے کے ناقابل تھے، اس کے باوجود دونوں اکٹھے رہتے تھے، لیکن اکٹھے رہنا اس المناک تنہائی کا حل نہ تھا۔ اُسے شاید ایک ایسے انسان کی ضرورت

تھی، جو اُسے سمجھ سکتا۔ اس دنیا میں ایسے انسان کا ملنا بہت مشکل ہے
اور جوں جوں بچوں کی تعداد بڑھتی گئی، اُس نے محسوس کیا کہ اُس کی
بیوی اُسے بالکل بھول رہی ہے، وہ دن رات کو بچوں کو نہلانے، کھانا
کھلانے، اور اُن کی تیمارداری میں مصروف رہتی۔ جوں جوں بچے بڑے ہوتے
گئے، اُن دونوں کے درمیان خاموشی کی اِک دیوار اُستوار ہوتی گئی اور جب
بچے اس قابل ہو گئے، کہ وہ کالج میں داخل ہو سکیں، تو وہ اپنے لڑکوں
کے ساتھ شہر چلی گئی، اور اب وہ اکیلا رہ گیا۔ اب کے اُسے ایسی باتیں
کرنی پڑیں، جس کی اجازت اُس کا ضمیر نہ دیتا تھا، بچوں کی تعلیم کے
لئے اُسے روپوں کی ضرورت تھی، روپے ——— روپے ———
روپے ——— اور روپے کہاں سے آ سکتے تھے، اُس کی تنخواہ قلیل
تھی، اور اُس کے لئے ناممکن تھا، کہ وہ اپنے بیوی بچوں کے لئے اتنا روپے
بھیج سکے، کہ وہ سب کالج میں تعلیم حاصل کر سکیں، لہٰذا اُس نے رشوت
لینا شروع کی، شروع شروع میں اُس کے ضمیر نے مزاحمت کی لیکن آہستہ
آہستہ وہ اِس شاہراہ پر گامزن ہوتا گیا۔ اکثر اُس کی زندگی میں ایسے لمحے
آتے۔ جب وہ نوکری کو ترک کرنے کا خیال کرتا، کیونکہ شہر کے
گرد و نواح میں اتنی غربت تھی، جس کے احساس سے ہی اُس کے بدن
میں جھرجھری آجاتی۔

ہسپتال میں جو لوگ دوائیاں لینے آتے تھے، وہ غربت کے بدترین
نمونے ہوتے تھے، اُن کے بدن اکثر ننگے ہوتے تھے، پاؤں میں گھاس

پھوس کی جوتیاں ہوتی تھیں، دس دس میل سے چل کر وہ دوائیاں لینے آتے تھے، پاؤں میں چھالے پڑ جاتے تھے، اور جب کبھی ہسپتال کے برآمدے میں بیٹھ کر وہ سستاتے، اور اپنی میلی کچیلی گٹھڑیوں سے کھانے کی چیزیں نکالتے، تو سوائے ایک سوکھی ہوئی روٹی کے انہیں کچھ نہ ملتا، اُس سوکھی، پتلی سی روٹی کو دیکھ کر اُن کی دھنسی ہوئی آنکھیں چمک اُٹھتیں، اور وہ روٹی کو توڑ موڑ کر مُنہ میں ڈالتے، اور جب کبھی روٹی کا سوکھا ہوُا ٹکڑا حلق میں اٹک جاتا، تو اُن کی بے حس، بے کیف آنکھیں باہر نکل آتیں، اور وہ جلدی جلدی پانی کا گھونٹ پیتے، تب جاکر کہیں اُن کا سانس درست ہوتا، اور جان میں جان آتی، کبھی کبھی وہ سوچتا کہ اس بھوک اور افلاس کا کیا علاج ہے، لیکن وہ سوچ سوچ کر چپ ہو جاتا، اور رجسٹر میں مریضوں کے نام درج کرنے لگتا، لوگ زیادہ تر اُن پڑھ تھے۔ اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑتے تھے، اکثر زمین گھاس ـــــ اور عورتوں پر لڑائی ہوُا کرتی تھی، اغوا عام ہوُا کرتے تھے، فصل کاٹنے کے وقت زیادہ قتل ہوُا کرتے تھے، اور اُن دنوں اُسے بھی کافی آمدنی ہوُا کرتی تھی چونکہ ریاست کے نوکروں کی تنخواہ قلیل تھی، اس لئے ریاست کے افسر عوام سے خوب رشوت لیا کرتے تھے، ایک تحصیلدار، ایک تھانیدار، پنشن پانے کے بعد دو تین کوٹھیاں بنا لیتا تھا گو اُن کی تنخواہ چالیس یا پچاس روپے سے زیادہ نہ ہوتی تھی ـــــ اگر اُس کی تنخواہ معقول ہوتی، تو شاید وہ اِن غریب

لوگوں سے کبھی رشوت نہ لیتا، لیکن اُس کی بیوی کے لمبے لمبے خط آتے،
جس میں روپوں کے متعلق زیادہ تقاضہ کیا جاتا، تنخواہ کے علاوہ وہ بہت
سے روپے اور بھی بھیجا کرتا تھا۔ اُس نے اس دوران میں اپنا خرچ کم
کر دیا۔ وہ اپنے کپڑوں پر بہت کم خرچ کرتا، اور لوگوں سے زیادہ سے
زیادہ رشوت لیتا۔ اُس کی خوراک میں کمی واقع ہو گئی۔ اور پھر اُسکے نوکر
بھی کتنے بددیانت تھے، وہ اکثر دودھ پی جاتے تھے، سبزیوں اور
ترکاریوں کو خوب ہڑپ کر جاتے، اگر کوئی چیز وہ بازار سے منگایا کرتا اس
میں سے بھی اپنا حصہ نکال لیتے، وہ دن رات کام کرتا۔ دور دور گاؤں
میں بیماروں کو دیکھنے جاتا، صبح ہوتی یا شام ہوتی، دھوپ ہوتی، یا
سردی ہوتی، وہ کسی کو نفی میں جواب نہ دیتا، کیونکہ باہر جانے سے
اُسے کچھ نہ کچھ فیس مل جاتی تھی، کام کی زیادتی کی وجہ سے اُسکی صحت
گرنے لگی، لیکن اُسے اِس بات کا فخر تھا کہ وہ اپنا فرض پورا کر رہا
ہے۔ وہ اپنے بال بچوں کو پال رہا ہے، وہ اپنی بیوی کو خرچ بھیج رہا
ہے، لیکن فرض کے ان سسکتے ہوئے لمحوں میں وہ اکثر اپنے آپ کو تنہا
محسوس کرتا، اور سمجھتا، کہ وہ اس دنیا میں بالکل اکیلا ہے۔ اُسکا کوئی
غمگسار نہیں، اُس کی روح کی پہنائیوں میں کوئی بھی نہیں جھانک
سکتا، اُس کے اردگرد کا ماحول اتنا جاذبِ نظر تھا، کہ وہ گھنٹوں
اس سے لطف اندوز ہوتا رہتا، اُس کے گھر کے سامنے ایک وسیع باغ
تھا۔ جس میں سیب اور ناشپاتیوں کے درخت تھے، سامنے دھان کے

پھیلے ہوئے کھیت تھے، اور ارد گرد اونچے اونچے پہاڑ، چیل اور دیودار کے درختوں سے مستور، اُس کے گھر سے کچھ فاصلے پر ایک ندی بہتی تھی، جس کی خاموش روانی اُس کی اپنی خاموشی سے ملتی جلتی تھی۔ جب شام ہو جاتی، اور سورج اُن چوٹیوں کے پرے غروب ہو جاتا، تو آس پاس کی چوٹیاں ان سنہری کرنوں سے جگمگا اٹھتیں، لیکن آہستہ آہستہ یہ لالی غائب ہو جاتی، اور تاریکی کا ایک بھیانک پردہ زمین کے اس ٹکڑے پر چھا جاتا، رات زیادہ خاموش ہو جاتی۔ چیڑ کے پتوں میں سے ہوا گذرتی، اور سیٹیاں بجاتی ہوئی نکل جاتی۔ دُور پہاڑوں پر گیدڑ اور شیر چنگھاڑتے۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ آوازیں بھی اس پھیلی ہوئی خاموشی میں جذب ہو جاتیں، اور زمین کا ٹکڑا سویا ہُوا معلوم ہوتا، یوں محسوس ہوتا، کہ اس پھیلی ہوئی فضا میں افیون رچی ہوئی ہے۔ اور رات ایک نہ ختم ہونے والا نشہ ہے، پھر وہ گھومنے لگتا، اُس کے نتھنوں سے سیب کے پتوں کی بھینی بھینی خوشبو ٹکراتی، اور جب کبھی اُس کی نظر آسمان کی طرف جاتی، تو ستارے ننھے ننھے بچوں کی طرح مسکراتے، لیکن اُسے اپنے دل کا خلا اس پھیلے ہوئے آسمان سے زیادہ وسیع اور بے پایاں معلوم ہوتا، جس کی گہرائیوں میں وہ آجتک خود نہ جھانک سکا تھا اُس نے ہر بار کوشش کی، کہ وہ زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ کر سکے، اُس نے خیال کیا تھا، کہ شادی کے بعد شاید اُسکی روح کو تسکین مل سکے گی، لیکن اُسکی بیوی نے دُکھائی کے سوا اُسے

کچھ نہ دیا تھا، اُس نے محسوس کیا۔ کہ وہ زندگی سے باہر رہا ہے۔ اور زندگی کو پانے کے لئے نہایت بے تابانہ طریق پر کوشش کرتا رہا ہے۔ .... تاکہ زندگی کی صحیح تشکیل کر سکے۔ لیکن شکست کے سوا اُسے کچھ نہ ملا تھا، اس احساس شکست نے اُسے ذہنی اور جسمانی طور پر کافی کمزور کر دیا تھا اور احساس کمتری کا جذبہ زیادہ نمایاں ہو گیا تھا۔ اُس کی زندگی بالکل بنجر، بے کیف، اور بے جان ہو گئی تھی۔ عورتوں سے اُسے اب خاص طور پر ڈر لگتا تھا۔ ایک غیر واضح، مبہم سا ڈر۔ جس کا تجزیہ وہ خود نہ کر سکتا تھا، اُس کا پیشہ کچھ ایسا تھا۔ کہ اُسے ہر روز عورتوں سے واسطہ پڑتا تھا، لیکن شرم، ڈر، اور جھجک کا خول اتنا مضبوط تھا، کہ اس خول کو توڑنا اُس کے لئے بہت محال تھا، اُس کی زندگی میں ایک دو بار ایسے مواقعے آئے، جب اُس کا ضمیر شدید طور پر ڈگمگایا، اور پھر اُس کی آنکھوں کے سامنے اُس لڑکی کی تصویر کھنچ گئی، ہاں وہ اُس لڑکی کو کبھی نہیں بھول سکتا، اُس کے خد و خال اُسکے ذہن پر ابھی تک مرتسم تھے، وہ اُس لڑکی کو دیکھ کر گھبرا گیا تھا، لڑکی کے چہرے سے عجیب وحشت سی ٹپکتی تھی، لڑکی کی آنکھوں کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔ اور گالوں پر نیلے نیلے نشان تھے، جو سیاہی مائل ہوتے جا رہے تھے ہونٹ خشک اور باسی تھے، سر کے بال بکھرے ہوئے تھے، عجیب قسم کی حیرانی، اور پریشانی اُس کے چہرے سے مترشح تھی۔ اُس کی قمیص اور سرخ سوسی کی سلوار جا بجا پھٹی ہوئی تھی، اور اُس کا سفید، بلوریں

جسم ان سوراخوں سے باہر جھانک رہا تھا، اُس کے پاؤں نہایت گندے اور خاک میں اَٹے ہوئے تھے، وہ دیر تک لڑکی کے خد وخال کو دیکھتا رہا۔ اور اُس کی قلبی واردات کا اندازہ کرتا رہا۔ دیر تک لڑکی اُس کے سامنے کھڑی رہی...... مظلومیت کی ایک زندہ تصویر —— جیسے عہدیوں کے مظالم اُس کے سوئے ہوئے پپوٹوں پر جمے ہوئے تھے، جیسے ان لبوں پر انسانی حیوانیت کی تاریخ لکھی گئی تھی۔ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ اس لڑکی پر اتنا ظلم کیوں ہوا تھا، لڑکی کی عمر چودہ سال سے زائد نہ تھی، اگر زیادہ بھی ہوتی۔ تو کیا ہوتا، لیکن وہ اتنی حسین کیوں تھی، اُس کا رنگ سیب کے پھولوں کی طرح تھا۔ اُس کی آنکھوں میں کیوں شباب کی غنودگی تھی، اُس کی گردن میں کیوں ہنس کے پروں کی سی سفیدی تھی، اتنی مظلوم ہونے کے باوجود اس لڑکی پر ظلم کرنے کو جی چاہتا تھا، کیا مظلوم ہمیشہ مظلوم ہی رہتے ہیں، یہ لڑکی کیوں چپ ہے، اس نے حیوانیت کے خلاف کیوں آواز بلند نہیں کی، کیا آج کیا اسوقت یہ لڑکی دوبارہ حیوانیت کے خلاف آواز بلند کرے گی؟ زنا بالجبر اور اُسے معائنہ بھی کرنا ہے اُس نے سوچا عورت اتنی حسین نہیں ہونی چاہیئے اور وہ اپنے ہاتھ ہنس کے پروں کی سی جلد پر پھیر لگا نشتر —— ایک ابدی نشتر۔ جیسے ساری کائنات سو گئی ہو، جیسے زندگی کی ہر سچائی اس لڑکی کی مظلومیت میں فنا ہو جائے گی، حسن ایک ابدی نشتر ہے، ایک نہ ختم ہونے والا نشتر، یہ دنیا فنا ہو جائے گی، لیکن عورت کا حسن فنا نہ ہو سکے گا، شفاف —— مرمریں —— جلد ——————

عورت اور حسن ـــــ زنا بالجبر۔ اور اُس نے سوچا کہ انسان کے اس قدیم وحشی جذبے میں اتنی حیوانیت نہیں ہے، جتنی اس لڑکی کے حسن میں پنہاں ہے اور اُس کا ہاتھ مرمریں جلد پر تھا، دو انچ ـــــ تین انچ اُس نے ناپ لیا اور پھر ٹھہر گیا۔ اُس کے دل و دماغ میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ ایک خوابیدہ سنسنی دوڑ گئی اور خون طوفان کی طرح لہریں مارنے لگا اور پھر اُس کے ہاتھوں پر اوس کے دو قطرے گرے۔ اُس نے محسوس کیا کہ وُہ برف کے گلیشیر سے ٹکرایا ہے اور اُس نے لڑکی کی سوچی ہوئی آنکھوں کی طرف دیکھا، جن سے اوس کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ وُہ پھر سنبھل گیا، لڑکی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور ہچکیاں لیتے ہوئے کہنے لگی "ڈاکدار میں میں بالکل بے قصور ہوں۔ تم نہیں جانتے کہ میرے ساتھ کتنا ظلم ہوا ہے۔"

"ظلم" وُہ بڑبڑایا

"ہاں، تمام رات پولیس والوں نے مجھے ایک کمرے میں بند رکھا اور تھانیدار نے زبردستی میرے ساتھ . . . . اور پھر پولیس کے دو کانسٹیبلوں نے بھی"۔ اور یہ کہہ کر وُہ رونے لگی۔ اُس کی ہچکیاں بڑھتی گئیں وُہ دیر تک لڑکی کے آنسوؤں کی طرف دیکھتا رہا۔ آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے اور انسان اپنی حیوانیت کے اوراق اُلٹ رہا تھا۔ ایک ـــــ دو ـــــ تین ـــــ چار ـــــ اور یُونہی سوچتا سوچتا باہر نکل آیا۔ سامنے یوکلپٹس کے درخت ایستادہ تھے جن کی ننھی ننھی ٹہنیاں

ہوا ہیں تھرا رہی تھیں۔ دُور تھوڑے فاصلہ پر لڑکی کا باپ کھڑا تھا۔ مغموم ——— اُداس، اکیلا، جو ڈاکٹری معائنہ کی رپورٹ کا انتظار کر رہا تھا۔

وُہ ان باتوں سے کبھی مرعوب نہیں ہوا تھا۔ اُس نے لڑکی کے باپ سے فیس لے لی اور مخالف پارٹی سے بھی ——— اُسے روپوں کی ضرورت تھی اور وُہ جذبات کی رَو میں بہنا نہیں جانتا تھا۔ گاؤں کے لوگ طرح طرح کی چیزیں اُس کے لئے لاتے۔ سبزیاں، ترکاریاں، سرسوں کا تیل، گھی مرغیاں، انڈے، دودھ کی کلاڑیاں، جلانے کے لئے لکڑیاں، کمبل شہد۔ اور اس طرح وُہ اپنی پوری تنخواہ بیوی بچوں کو بھیج دیتا۔ اور اپنے آپ کو رشوت کے روپوں پر پالتا۔ لوگ اُسے عجیب عجیب قسم کی رشوت دیا کرتے تھے۔ وُہ اُس بوڑھے فقیر کو کبھی نہیں بھول سکتا جس کا دایاں بازو ٹوٹ چکا تھا اور وُہ معائنہ کے لئے ہسپتال میں آیا تھا۔ بوڑھے فقیر کے پاس فیس کے لئے کچھ نہ تھا۔ اس لئے اُس نے ڈاکٹری معائنہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وُہ ان غریبوں کا نوکر نہ تھا وُہ تو اس ریاست کے حکمران کا نوکر تھا، اُسے اس فقیر پر بہت غصہ آیا آخر یہ فقیر کیوں لڑتے جھگڑتے ہیں۔ اگر یہ راہبانہ زندگی بسر کرتے ہیں تو پھر دُنیادی جھگڑوں میں کیوں اُلجھتے ہیں اور پھر اس فقیر نے تو شادی بھی کی ہوئی تھی اور اُس کی ایک لڑکی بھی تھی، جو ایک دُور افتادہ گاؤں میں مقیم تھی، یہ بھک منگے شادیاں کیوں کرتے ہیں اور پھر بچے پیدا کرتے

سے ذرا بھی نہیں جھجکتے۔ کیا دُنیا میں ایسا کوئی نظام نہیں، جہاں ایسی شادیوں کو ممنوع قرار دیا جائے، تا کہ بھوک اور افلاس میں کچھ کمی ہو جائے۔

اُس رات سخت سردی پڑی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کہیں اونچی چوٹیوں پر برف پڑی ہے۔ ہوا خوفناک طور پر سرد تھی اور چیڑ کے نوکیلے پتوں میں سے ہوا شور مچاتی ہوئی گذر رہی تھی۔ اُس نے وارڈ میں چکر لگایا۔ اور مریضوں کی دیکھ بھال کر کے اپنے کمرے میں آگیا۔ آج بلا کی سردی تھی آتشدان میں آگ جل رہی تھی۔ وُہ بستر پر دراز ہو گیا۔ اُس کے پاؤں یخ بستہ ہو گئے تھے۔ وُہ دیر تک کانپتے ہوئے شعلوں کی طرف دیکھتا رہا تھوڑے عرصہ کے بعد نوکر نے آکر اطلاع دی، کہ فقیر آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ نوکر چلا گیا، اور پھر فقیر، اُس کی بیوی اور ایک نوجوان لڑکی اُس کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ سب نے اُسے جُھک کر سلام کیا او آتشدان کے قریب بیٹھ گئے۔

"کیوں فقیر، کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں حضور،" فقیر نے کہا۔

"آج سردی بہت ہے ڈاکدار صاحب۔" فقیر کی بیوی نے کہا۔

"ہاں۔" اُس نے رضائی کو اپنے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔

اور پھر اُس کی نگاہیں سہمی ہوئی لڑکی کی طرف جا پڑیں۔ لڑکی نے اُس کی طرف دیکھا اور آنکھیں نیچی کر لیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لڑکی نے آنے والے طوفان کا پہلے ہی سے اندازہ کر لیا تھا۔ آتشدان میں لکڑیاں

چیخ رہی تھیں، کمرے میں ایک زرد لمپ روشن تھا اور باہر چیڑ کے درختوں میں ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔

"یہ میری لڑکی رینی ہے، آج ہی مجھے ملنے آئی ہے"

"اوہ، تمہاری لڑکی ہے"، یہ سُنکر اُس کا اشتیاق اور بڑھ گیا۔

یہ نمبردار کے گھر بیاہی ہوئی تھی۔ لیکن نمبردار نے اُسے چھوڑ دیا تھا اور اب یہ ایک اور آدمی کے پاس رہتی ہے۔ فقیر نے یہ الفاظ بغیر کسی جھجک کے کہہ دیئے۔

اُس نے لیمپ کی ٹمٹماتی ہوئی زرد روشنی کی طرف دیکھا۔ لیمپ کی زرد روشنی کمرے کی سہمی ہوئی فضا میں کانپ رہی تھی۔ اُس کی نگاہیں فقیر اور اس کی بیوی سے ہٹ کر لڑکی کے زرد چہرے پر جم گئیں، لکڑیاں جل رہی تھیں اور آگ کے زرد شعلے معصوم تمناؤں کی طرح ادھر اُدھر بھٹک رہے تھے اور لڑکی کا سہما ہوا چہرہ اس ماحول میں ایک پر ہول منظر پیش کر رہا تھا۔ آگ کے لپکتے ہوئے شعلے، کمرے کی جامد فضا اور اُس کا ٹھٹھرا ہوا سرد بستر اور لڑکی کا سہما ہوا چہرہ ——

اُس نے سوچا کہ جلتی ہوئی لکڑیوں کی روشنی میں لڑکی کا حُسن دو بالا ہو گیا ہے۔ اگر وُہ حسین نہ بھی ہوتی تب بھی وُہ اُسے پسند تھی۔ اُس کی بیوی ایک عرصے سے بچوں کو لے کر بڑے شہر چلی گئی تھی اور وُہ کئی سالوں سے اس زندگی میں اکیلا سفر کر رہا تھا —— اکیلا —— اکیلا —— بالکل اکیلا —— لیکن آج —— کیا ہی اچھا ہو کہ لڑکی اُس کی

بات مان لے۔ اور وُہ لڑکی کی طرف دیکھنے لگا اور لڑکی شعلوں کی طرف دیکھتی رہی، اور آتشدان میں لکڑیاں جلتی رہیں اور لیمپ کی زرد روشنی کمرے میں رینگتی رہی۔

"ڈاکدار صاحب، کل آپ ضرور معائنہ کر کے اپنا فیصلہ لکھتے" فقیر نے کہا۔

"تُم نے تو ابھی تک فیس بھی نہیں دی"۔

"جناب فیس کہاں سے لاؤں میرے پاس تو ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں"۔

اُس نے لڑکی کی طرف پُر معنی نظروں سے دیکھا اور پھر فوراً ہی وُہ فقیر کی طرف دیکھنے لگا۔ "فقیر! تم جانتے ہو، کہ یہ فیس سرکار کی ہوتی ہے، جب تک تم فیس نہیں دو گے، میں تمہارا ڈاکٹری معائنہ نہیں کر سکتا"۔

"جناب . . . . "! فقیر کی آواز میں ایک لرزش سی آگئی۔ "غریب پر رحم کیجئے، میں ایک فقیر ہوں، محض بھک منگا"۔

"سرکار کا قانون سب پر حاوی ہوتا ہے، قانون چھوٹے بڑے کی تمیز نہیں کرتا"۔

یہ جواب سُنکر فقیر چُپ ہو گیا، باہر ہوا زور زور سے سائیں سائیں کرنے لگی اور وادی پر تاریکی اور گہری ہوتی گئی، کبھی کبھی جنگلوں میں گیدڑوں کے چلّانے کی آوازیں آتیں لیکن وُہ بند کواڑوں سے ٹکرا کر

باہر ہی رہ جاتیں۔

اُس نے صرف اتنا ہی سُنا ”اچھا حضور ———— میں جاتا ہوں“

پھر تاریکی کا ایک اور ریلا آیا . . . . . . اُس میں فقیر اور اُس کی بیوی غائب ہو گئے۔ لڑکی وہیں بیٹھی رہی۔ اُس نے لڑکی کو چلے جانے کے لئے نہیں کہا اور وہ کہتا بھی کیوں، اُس کے پاس اتنی باتیں کرنے کا وقت کہاں تھا۔ تاریکی اُس کے ذہن میں پھیل رہی تھی۔ تاریکی لحظہ بہ لحظہ ہر طرف پھیل رہی تھی۔ سر سے لپکتی ہوئی، اُس کے سینہ میں، اُس کے بازوؤں میں، اُسکے بدن میں، اُس کی ٹانگوں میں۔ اور اُس نے اپنے آپ کو تاریکی کے حوالے کر دیا۔ ایک نیم وحشیانہ جذبہ کے زیر اثر اُس نے اپنے آپ کو بالکل بے دست و پا پایا۔ لیمپ کی زرد روشنی ٹمٹماتی رہی۔ آتشدان کی لکڑیاں چٹخ چٹخ کر مدہم ہو گئیں۔ شاید اب اُسے آتشدان کے دہکتے ہوئے کوئلوں کی ضرورت نہ تھی۔ اُس کے جسم کی آگ بھڑک چکی تھی اور اُس قدیم وحشیانہ شعلہ کی لپیٹ میں، ایک معصوم لڑکی کا جسم بھی آ چکا تھا زرد روشنی تاریکی میں مبدل ہو چکی تھی ———— صرف وادی میں ہوا کراہ رہی تھی۔

اگر گذرے ہوئے واقعات نے اُسے اُن جنونی دنوں میں مسرت کے چند لمحات دیئے، تو وہ خوشی۔ وہ تسکین، محض جسمانی تھی، اس خوشی میں اُس کی روح شامل نہ تھی۔ وہ بالکل الگ تھلگ کھڑی تھی، اُس

سمندری چٹان کی طرح جس کے چاروں طرف پانی ہو، لیکن جس کا سینہ پانی کی لپیٹ سے باہر ہو اور کبھی کبھی اُسے خیال آتا کہ اگرچہ مسرت حاصل کرنے کے لئے ہمارے پاس ہر چیز موجود ہے لیکن خوشی پھر بھی عنقا ہے ان واقعات نے ہمیشہ کے لئے اُس کے شباب کو زہر آلود کر دیا اور شباب کی تپش آہستہ آہستہ بڑھاپے میں مبدل ہونے لگی تو اُسے ہر طرف یاسیت ہی نظر آنے لگی، دراصل موجودہ زندگی میں ایک قسم کا ہیجان بھرا ہوا ہے۔ اس مشینی دور میں شباب کا لپکتا ہوا شعلہ تو ہے۔ اور دم توڑنے والا بڑھاپا بھی، لیکن زندگی کا وہ حصہ غائب ہے جو شباب اور بڑھاپے کے درمیان ہوتا ہے، جب کہ انسان شباب کی تیزی اور تندی سے مجبور ہو کر آئندہ آنے والے بڑھاپے کا انتظار کرتا ہے۔

——— اس مشینی دور میں شباب کا لپکتا ہوا شعلہ مشین کے پہیوں میں کراہ کراہ کر بڑھاپا بن جاتا ہے اور انسانی زندگی اُن آسودگیوں، لطافتوں اور رنگا رنگ کیفیتوں سے محروم ہو جاتی ہے جو نہ شباب کی گرمی یا تپش عطا کر سکتی ہے، اور نہ بڑھاپے کی تسکین وہ وہ شام ——— اب وہ زندگی کی اُس شاہراہ پر آچکا تھا۔ جب اُسے مسلسل آرام کی ضرورت تھی۔ لیکن اُس زندگی میں آرام کہاں، اُس کی بیوی دور شہر میں تھی، اس پر روپوں کا بھی تقاضا کیا جاتا تھا، شاید اُس کی بیوی اور لڑکے اُسے روپوں کی مشین سمجھتے تھے کہ وہ روپے بناتا جائے اور وہ خرچ کرتے جائیں . . . . . کبھی کبھی وہ سوچتا کہ وہ کیوں اپنی زندگی

بسر نہ کرے، اپنی زندگی ـــــــ جسے وُہ اپنی زندگی کہہ سکے، جانکی کو اُس نے ایک بار کہا تھا۔ "کہ تم نے مجھے زندگی سے آشنا کر دیا ہے۔ جانکی واقعی اُسے چاہتی تھی۔ اگر وُہ بیوہ نہ ہوتی تو وُہ اُس سے شادی کر لیتا، گو وہ حدِ شباب سے گذر چکی تھی۔ لیکن اُس کے جسم میں ابھی تک کافی لچک تھی، اُس کے خد و خال میں ابھی تک شباب کی رنگینی تھی۔ جانکی کی عمر ۳۰ سال کے لگ بھگ ہو گی، لیکن جب کبھی وُہ چلتی۔ تو اُس کے سر سے اب بھی دوپٹہ ڈھلک جاتا اور جیسے وُہ ابھی تک چودہ سال کی لڑکی ہے۔ اُس کی چال میں انداز تفاخر تھا، ایک مخصوص قسم کا رعب حُسن جو دیکھنے والوں پر حاوی ہو جاتا، اور جب کبھی وُہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرتی۔ تو بڑے بڑے "شہسواروں" کے چھکے چھوٹ جاتے اگر وُہ بیوہ ہو گئی تھی۔ تو اُسے اس بات کا کوئی خاص رنج نہ تھا۔ بھلا اگر اُس کا خاوند مر گیا تھا۔ تو اس میں اُس کا کیا قصُور تھا۔ وُہ اب بھی ایک نئی نویلی دُلہن کی طرح کپڑے پہنتی، زنگا رنگ دوپٹے اوڑھتی اور ہاتھوں میں مہندی لگاتی اور آنکھوں میں کاجل کی ایک نیم خوابیدہ ہلکی سی لکیر، ایک موہوم اُداس سی جھلک اُس کے چہرے پر نمایاں ہوتی اور ہونٹوں پر ضرورت سے زیادہ لالی، جو اُسے بہت ہی ناپسند تھی۔ وُہ مٹک مٹک کر چلتی۔ لمبا قد، یوکلپٹس کے درخت کی طرح صاف اور ستھرا اور جب کبھی وُہ مڑ کر اُس کی طرف دیکھتی تو سر سے اُس کا دوپٹہ ڈھلک جانا اور کانوں میں مرغابیوں کے سے کالے کنڈل لہراتے اور بائیں ہاتھ کو

ایک طرف جھٹکتی اور دائیں طرف کو جھکتی ہوئی وُہ آگے بڑھ جاتی ——
وُہ بہت باتیں کر سکتی تھی۔ اکثر وُہ اُسے گاؤں بھر کی باتیں سناتی۔ آج تھانیدار نے اُسے گھر بلایا تھا، تحصیلدار نے فلاں چیز اُسے بھیجی۔ آج محلّے والوں نے اُسے گالیاں دیں۔ آج سکول کے ہیڈ ماسٹر نے مُسکرا کر اُس کی طرف دیکھا۔ مندر کا پنڈت دیر تک اُس سے باتیں کرتا رہا لوگوں کے طعنے اُسے سُناتی کہ وُہ کیوں ماری ماری پھرتی ہے، وُہ بے شرم ہے۔ اُسے عزت کا پاس نہیں۔ وُہ کیوں افسروں کے گھروں میں جاتی ہے۔ اُن سے باتیں کرتی ہے۔ اُن سے چیزیں لیتی ہے۔ ہندو ہو کر مسلمانوں سے باتیں کرتی ہے۔ مسلمان افسروں کے گھروں میں جاتی ہے اور جو چیزیں وُہ دیتے ہیں وُہ لے لیتی ہے۔ اُسے مذہب کا پاس نہیں، ہندو دھرم کو اُس نے بالکل ڈبو دیا ہے۔ ایسی شیطان عورت کبھی گاؤں بھر میں پیدا نہیں ہوئی، اور پھر ہندوؤں میں۔ توبہ، توبہ،
باوجود اُن کے وُہ جانکی کو چاہتا تھا، وُہ بغاوت جو جانکی نے جبلّی طور پر پرانی روایات کے خلاف اُٹھائی تھی، اُسے پسند تھی۔ خود اُس کے سینہ میں ایسے ہی خیالات موجزن تھے۔ ان خیالات کو وُہ اُگل دینا چاہتا تھا۔ وُہ ایک ایسی زندگی بسر کرنا چاہتا تھا۔ جس میں کمینگی نہ ہو۔ جس میں اُس کی رُوح کا عکس ہو وُہ رُوح جو ساٹھ سال سے آزاد ہونے کے لئے تڑپ رہی تھی۔ جانکی اُس کے گھر آتی، اور جب وُہ کھانسی کی شدت سے بیمار ہو جاتا۔ تو وُہ اُس کی تیمارداری کرتی، اُسے دوا پلاتی، اُس کے

سینہ پر مالش کرتی اور جب وُہ تندرست ہو جاتا تو اُس کے پاس بیٹھتی اور یونہی ہنستے ہنستے اُس کے پاؤں پکڑ لیتی اور نرم نرم اُنگلیوں سے گدگدی کرتی اور کبھی کبھی اُس کے بڑھے ہوئے پیٹ میں ایک اُنگلی چبھو دیتی اور وُہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتا، اور وہ اُسے اٹھا کر اپنے زانو پر بٹھا لیتا اور اُس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہتا۔ وُہ اتنی جاذب نظر نہ تھی۔ لیکن بیوہ ہوتے ہوئے بھی اُس نے اپنے حُسن کو قائم رکھنے کی پوری کوشش کی تھی، لیکن بڑھاپا پھر بھی چہرے سے عیاں تھا۔ لیکن آواز میں ابھی تک نسائیت تھی۔ قد میں ابھی تک رعنائی تھی اور یونہی بیٹھے بیٹھے اُسے خیال آتا کہ وُہ جانکی سے شادی کر لے اور اپنی بیوی کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دے، آخر اُس کی بیوی نے اُس کے لئے کیا کیا تھا؟ اُس کے لڑکوں نے اُس کے ساتھ کون سا اچھا سلوک کیا تھا۔ بڑے لڑکے نے شادی کر لی تھی۔ چھوٹا لڑکا بھاگ کر فوج میں بھرتی ہو گیا تھا، اور اُس کی لڑکی کی شادی ہو گئی تھی اور وُہ اپنے خاوند کے ساتھ رہتی تھی اور جب کبھی وُہ گھر آتی تھی، تو اپنے ننھے بچے کو اُس کی گود میں دھکیل دیتی تھی۔ جیسے زندگی بھر اُس کا کام بچے پالنا ہی تھا۔

وُہ اکثر اس گھریلو زندگی سے رہائی پانے کی کوشش کرتا اور اُس کے دماغ کے بے جان کونے میں جانکی کی تصویر اچھلتی کودتی رہتی وُہی اُس کی تسکین کا سہارا تھی۔ اُس کے بے جان، بے حس خوابوں کی

ملکہ، اگر اُس نے خوشی کے چند لمحات گزارے تھے، جہاں اُسے اپنی رُوح کی مسرت کا بھی احساس ہوا تھا تو وُہ جانکی کی قربت تھی، جب کبھی وُہ جانکی کے ساتھ ہوتا، تو اُس کی اپنی شخصیت اُس کے سامنے آ جاتی، وُہ اس کے ساتھ بیٹھ کر ایسا محسوس کرتا، جیسے اُس کی شخصیت بدل گئی ہو، جیسے وُہ پہلا سا انسان نہیں تھا جو جامد تھا، جو چُپ رہتا تھا، جو مذاق نہیں کرتا تھا۔ گو جانکی خوبصورت نہ تھی، لیکن پھر بھی وُہ اُسے رفیقۂ حیات بنانا چاہتا تھا، بیوی نہیں، اس دُنیا میں بیویاں بُہت مل سکتی ہیں، لیکن عورت نایاب ہے۔ ایک ایسی عورت جو اُس کی رُوح کے خلا کو پُر کر سکے۔ وُہ کِس طرح اس عورت سے شادی کر سکے گا، وُہ اس نظام میں رہتا تھا جس کی زنجیروں میں وُہ پوری طرح جکڑا ہوا تھا۔ جہاں وُہ ذہنی بغاوت تو کر سکتا تھا۔ لیکن اُس ذہنی بغاوت کو عمل میں لانا، اُس کی طاقت سے باہر تھا اور جب جانکی اُسکی نظروں سے اوجھل ہو جاتی تو اُس کے دل و دماغ پر ایک بے کیف، بے لذت سی نفرت چھا جاتی، اُسے اس گھر سے نفرت سی ہو گئی تھی، وُہ اِن لوگوں سے دُور بھاگنا چاہتا تھا۔ وُہ جانتا تھا کہ اب گھر والوں کو اُس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ کئی بار اُس کے بڑے لڑکے نے اُسے گھر سے نکل جانے کیلئے کہا تھا۔ کئی بار اُس کی بہو نے اُسکی بیعزتی کی تھی۔ یونہی بوڑھا دن بھر کھانستا رہتا ہے، سوائے بلغم کے اس کے پاس اور کچھ بھی نہیں، اب اُس کے پاس کیا ہے، صرف بلغم ——— اب روپوں کی کھنکھناہٹ نہیں رہی، اُس نے محسوس کیا، آدمی اور آدمی

کے درمیان کوئی رشتہ ہے، تو اقتصادی، محض اقتصادی ——— سکّے لوہا، پنسل۔ جارج ششم کی مُہر۔ اب اُس کی بیوی اُس سے بالکل بے نیاز ہو چکی تھی، اُسے غصہ آتا تھا، اپنے آپ پر، اپنے لڑکوں پر، اور اس ماحول پر۔ اور کبھی کبھی وُہ سوچتا کہ آزادی کس بلا کا نام ہے، آخر آزادی کیا چیز ہے اور اس دُنیا میں کون آزاد ہے۔ وُہ ساٹھ سالوں سے رہائی پانے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن ابھی اُسے آزادی نصیب نہیں ہوئی تھی رات کے وقت یہ خیالات اُسے بہت تنگ کرتے۔ لیکن صبح ہوتے ہی یہ خیالات منتشر ہو جاتے۔

اب وُہ بوڑھا ہو چکا تھا، ایک بلغمی انسان، جس کا ہر سانس بلغم کشید کرتا تھا۔ اُس کے سر کے بال سفید ہو چکے تھے۔ اور کھانسی اور دمہ نے اُسے نہایت نحیف اور لاغر کر دیا تھا، اُس کے جسم کا گوشت ڈھیلا ہو گیا تھا اور ہڈیوں سے اپنا ناطہ توڑ رہا تھا، جسم میں نہ سختی تھی نہ تناؤ۔ گالوں میں گڑھے پڑ چکے تھے، چہرے کا رنگ سیاہ ہو چکا تھا، جسم کی رگیں اُبھر آئی تھیں، خون کی رفتار نہایت ہی سست تھی اور جب کبھی وُہ اپنے سینے پر ہاتھ پھیرتا تو سینہ کی پسلیاں اُسے چُبھتیں اور بلغم پھیپھڑوں میں گھر گھر کرتا، اور اب آنکھوں کی بینائی کمزور ہو رہی تھی، برق رفتاری سے آنکھوں کی روشنی معدوم ہو رہی تھی۔ دِن بدن، لحظہ بہ لحظہ، اور وُہ دِن دور نہیں، جب وُہ ہمیشہ کے لئے اندھا ہو جائیگا اور پھر یکایک اُس نے

محسوس کیا کہ خاموشی اُس کے باہر، اُس کے اندر اکٹھی ہو رہی تھی اور وُہ اس دُنیا میں بالکل اکیلا کھڑا تھا، خزاں کے جھڑے ہوئے پتّے کی طرح اور وقت اُس کے اُوپر، دائیں بائیں بہہ رہا تھا، حال کی بے ہنگم آوازیں کبھی کبھی قریب اور کبھی کبھی دُور اُس کے کانوں کے بے حس پردوں کو کھٹکھٹا رہی تھیں، یہ آوازیں تیزی سے اُس کی طرف بھاگتیں اور پھر اس بڑے شور میں مدغم ہو جاتیں۔ اُس کے کانوں میں کتّوں اور گیدڑوں کے چلّانے کی آوازیں آنے لگتیں، ہوا زور زور سے چلنے لگتی اور چیڑھ کے بنوں میں ایک مدھم شور برپا ہو جاتا، اور دُور ندی اُسی طرح بے جان، بے حس، بے کیف اور سست نظر آتی جو ایک تھکے ہارے مسافر کی طرح چلی جا رہی تھی، سیب اور ناشپاتیوں کے درخت اُسی طرح ایستادہ تھے، لیکن پھیلے ہوئے اندھیرے کی وجہ سے وُہ اُنہیں نہ دیکھ سکتا تھا، ہوا پھر زور زور سے چلنے لگی۔ ٹھنڈی، سرد، برفیلی ہوا۔ اُس نے کھانسنا شروع کیا اور بلغم اُس کی چھاتی میں رُکتی ہوئی معلوم ہوتی، پتّے آہستہ آہستہ گر رہے تھے اور سُوکھے، زرد، جھلسے ہوئے پتّوں کے گرنے کی آوازیں اس بے پایاں شور میں ہمیشہ کے لئے غرق ہو رہی تھیں۔ اُس نے محسوس کیا کہ آج وُہ اکیلا ہے —— آج وُہ بالکل اکیلا ہے —— آج جانکی بھی اُس کے ساتھ نہ تھی۔ آخیر میں کچھ بھی نہیں رہتا۔ اُس نے سوچا۔ اُسے صرف اس بات کا رنج تھا کہ اُسے اپنی زندگی بسر کرنے کا کبھی موقعہ نہ ملا۔ حتیٰ کہ وُہ اپنے آپ سے بھی الگ ہو گیا۔ برفیلی ہوا کا ایک تیز ریلا آیا اور وُہ کھانستا کھانستا اندر چلا گیا۔

برف
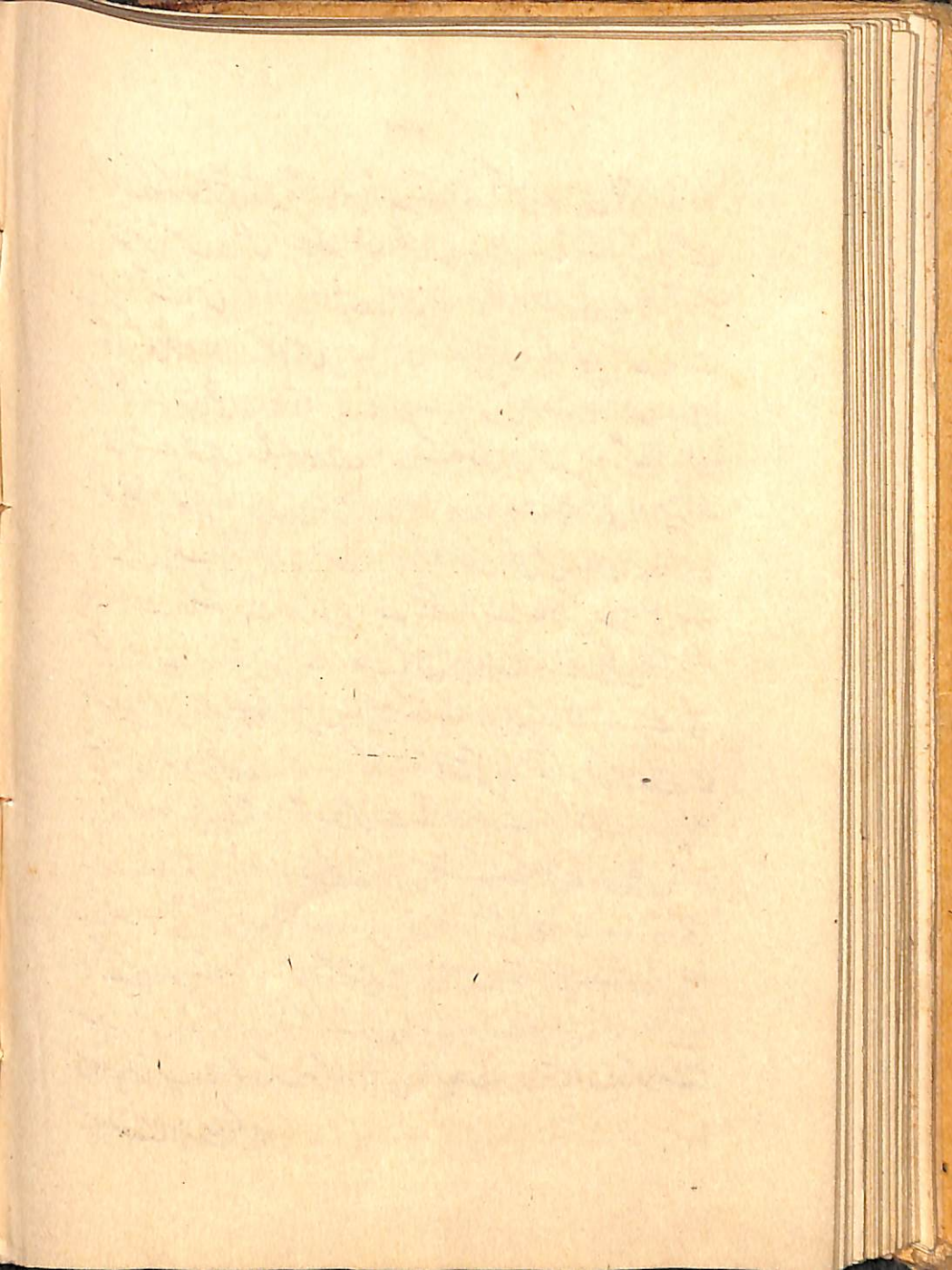
وہ لکڑی کی کرسی پر اپنی پتلی دبلی ٹانگوں کو اکٹھا کرکے بیٹھا ہوا تھا۔ اسکی رانیں پیٹ سے ہمکنار ہوتی ہوئی اوپر کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنی ٹھوڑی کو گھٹنوں پر رکھتے ہوئے باہر نظر دوڑائی۔ آسمان بادلوں سے گھرا ہوا تھا اور ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی ہوا کا تیز جھونکا آتا تو وہ سردی سے مغلوب ہو کر اپنے دائیں ہاتھ کو رانوں میں دباتے ہوئے پنچتارے کے درخت کی طرف دیکھنے لگتا۔ پنچتارے کا درخت پھولوں سے لدا ہوا تھا۔ سرخ سرخ پھول اس کی آنکھوں کے سامنے تیرتے ہوئے نظر آئے۔ اس ہلکی ہلکی بارش میں پنچتارے کے پھول محبوب کے لبوں کی طرح نظر آتے تھے۔ سرخ تر و تازہ نازک بوسوں کی نمی میں بھیگے ہوئے۔ کبھی کوئی پرندہ درخت کی نازک ٹہنی پر آتا اور اپنے نرم و نازک پروں کو ہلاتا ہوا، اکڑوں ہو کر بیٹھ جاتا۔ ہوا سرد تھی، ٹھنڈی اور یخ بستہ جسم کے ہر مسام میں سرایت کر رہی تھی۔ وہ اس اذیت ناک سردی کو شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ اسلئے وہ کرسی پر ٹانگوں کو اکٹھا کرکے اور اکڑوں ہو کر بیٹھا ہوا تھا اور اس کا دایاں ہاتھ رانوں میں دبا ہوا تھا۔ اس کے چہرے سے یاسیت اور بے بسی ٹپکتی تھی۔ اسکی کرسی برآمدے میں تھی اور برآمدے کے ایک کونے میں چولھا تھا جس میں سے بجھی بجھی سا دھواں اٹھ رہا تھا۔ وہ دیر تک اس سادہ

دھوئیں کی طرف دیکھتا رہا۔ دھواں برآمدے میں ہی چکر لگا رہا تھا جیسے باہر کھلی فضا میں جانے سے ڈرتا ہے۔ کبھی کبھی ہوا کا یخ بستہ جھونکا ذرا تیزی سے آتا تو اُسکی ناک اور کان سردی سے نیلے ہو جاتے اور وُہ اپنے جسم کو سکیڑتا اپنے پیٹ کو ٹانگوں سے بھینچتا اور ــــــ ہاتھ کو گرم گرم رانوں میں دباتا ہوا سُرخ سُرخ پھولوں کی طرف دیکھنے لگتا۔ کبھی کبھی اُس کی نگاہیں ان پھولوں سے ہٹ کر سامنے کی کھڑکی کی طرف جاتیں۔ اُسے اس کھڑکی کی جانب دیکھنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ جب وُہ پہلی بار اس گھر میں وارد ہوا تھا تو اسی برآمدے میں بیٹھ کر اُس نے سُرخ ہونٹوں والی لڑکی کو دیکھا تھا۔ اُن دنوں وُہ اکیلا نہ تھا بلکہ اُس کی والدہ اُس کے ساتھ تھی۔ اُس کی والدہ کو یہ پسند نہ تھا کہ وُہ کبھی شہر کی جوان لڑکیوں کی طرف دیکھے اور جب کبھی جوان لڑکیاں گھر میں آتیں تو اُس کی ماں اُسے گھر سے باہر چلے جانے کو کہتی، یا وُہ خود ہی دوسرے کمرے میں چلا جاتا۔ اُس کی ماں یہ کبھی برداشت نہ کر سکتی تھی کہ اُس کا لڑکا کسی نوجوان لڑکی سے گفتگو کر سکے اور لڑکیاں بھی اُس کی ماں سے بہت خوفزدہ تھیں اور جب کبھی وُہ اُس کی ماں سے ملنے آتیں تو کانپتی، ڈرتی، سہمی ہوئی گھر میں داخل ہوتیں اکثر وُہ سر ڈھانپ کر آتیں اور اُنکی نگاہیں زمین کیطرف لگی ہوتی تھیں۔

اُس نے آج تک کسی لڑکی کو قہقہہ لگاتے نہ سُنا تھا۔ لڑکیاں ہمیشہ سرگوشیانہ انداز میں باتیں کرتیں۔ وُہ دل ہی دل میں اپنی ماں کو کوستا رہتا تھا۔ آخر اس کڑی نگرانی کا کیا مطلب تھا؟ لیکن وُہ اپنی ماں کے خلاف کچھ نہ کہہ سکتا تھا اور وُہ کہتا بھی کیونکر، اُسکی عمر ہی کیا تھی، یہی اٹھارہ سال۔ جب وُہ کالج میں نیا نیا داخل ہوا تھا تو زندگی کے متعلق اُس کی معلومات نہایت محدود تھیں۔ شاید اُس کی ماں اُس سے بھلے کے لئے کہتی ہو اور یہ روک تھام، یہ کڑی نگرانی، یہ بندشیں اُس کے لئے مفید ثابت ہوں۔ لیکن وُہ

اس عمر میں کچھ اور ہی محسوس کر رہا تھا۔ وُہ ایک نئی لذت سے آشنا ہو رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو کھلی فضا میں چھوڑنا چاہتا تھا تاکہ وُہ ایک پرندے کی طرح اس فضا میں اڑتا رہے حتیٰ کہ اُس کے پر اس اُڑان سے تھک جائیں اور وُہ اس تھکن سے چور ہو کر اس مخملیں گھاس پر لیٹ جائے اور سوچتا رہے۔ کس کے متعلق؟ یہی تو وُہ سوچنا چاہتا تھا۔ وُہ اٹھارہ سال کی عمر میں ایک نئی لذت، ایک نئی مسرّت، ایک نئی قوت سے دوچار ہو رہا تھا اور جب کبھی وُہ کسی جوان لڑکی کی طرف دیکھتا، تو اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا پھر وُہ لڑکی کو دیکھ کر شرما جاتا جیسے وُہ کسی فاش غلطی کا مرتکب ہوا ہے اور اگر لڑکی بھی اُسکی طرف دیکھ لیتی تو اُس کا دل خوشی سے اچھلنے لگتا اور تمام رات لڑکی کا چہرہ اُس کی آنکھوں کے سامنے گھومتا رہتا، اکثر وُہ لڑکی سے دوبارہ ملنے کی تمنا کرتا اور جب کبھی شہر کی گلیوں میں لڑکی اُسے ملتی تو وُہ اُسکی طرف دیکھتا ہی رہتا۔ مگر اس سے کچھ نہ کہہ سکتا اور جب وُہ اُس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی تو وُہ اپنے آپ کو کوسنے لگتا کہ وُہ کیوں نہ اس سے بات کر سکا اکثر اُسے اس بات کا خدشہ لگا رہتا تھا کہ اُس نے کسی لڑکی کو چھیڑ دیا اور لڑکی نے اُس کی ماں سے شکایت کر دی تو وُہ مُنہ دکھانے کے قابل نہ رہے گا۔ اسی وجہ سے وُہ گھٹا گھٹا سا رہتا تھا اور اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ اُس کے جسم کے اندر ایک طوفان بند ہے رہائی کے لئے بیتاب ہو رہا ہے۔

اور اب وُہ اپنی ماں سے ۵۰۰ میل دُور تھا۔ اُس کی حرکات و سکنات اور اُس کی باتوں میں خود اعتمادی آ گئی تھی۔ وُہ اب لڑکیوں کو بیباک نگاہوں سے دیکھتا تھا اور کبھی کبھی انہیں اشارے بھی کیا کرتا، اس لڑکی کے ہونٹ کتنے سُرخ تھے جو اکثر کھڑکی کے قریب کھڑی ہوا کرتی تھی وُہ صبح کے وقت وہیں بال سنوارا کرتی۔ مشرق سے سُورج کی کئی تازہ کرنیں اُسکے

بالوں کو چومتیں اور وُہ اُن لمبے لمبے تاروں کو حیرت سے دیکھا کرتا۔

کاش وُہ اُن بالوں کو چھُو سکتا اور اُن کی ملائمت سے لطف اندوز ہو سکتا۔ لڑکی کے بال کتنے سیاہ تھے۔ جیسے سردیوں کی راتوں کی تمام سیاہی اُس کے بالوں میں جذب ہو گئی ہو۔ لیکن سب سے جاذبِ نظر چیز لڑکی کے سُرخ ہونٹ تھے۔ وُہ اکثر لڑکی کو برآمدے میں آنے کیلئے کہتا اور لڑکی اُس کی طرف مسکرا کر دیکھتی۔ اُس کی مسکراہٹ میں کتنی رونق تھی۔ صبح کی دھوپ میں لڑکی کے ہونٹ اور چمکنے لگتے۔ لبوں پر اور سُرخی آجاتی اور وُہ اپنے سیاہ ریشمی بالوں میں نہایت تیزی سے کنگھی کرنے لگتی۔ کبھی کبھی وُہ دھیمی آواز میں گنگنانے لگتی۔ آواز دھیمی ہوتی تھی، نہایت ہی مدھم اور شیریں۔ اس لئے وُہ لفظوں کا مفہوم نہ سمجھ سکتا تھا، کیا یہ ضروری تھا کہ وُہ لفظوں کے مفہوم کو سمجھ سکے۔ کیا آواز کی موسیقی چھپی ہوئی لڑکی کی کچھ کچھ دبی ہوئی خواہشوں کو بے نقاب نہ کر رہی تھی ——— پھر وُہ برآمدے میں ٹہلنے لگتا۔

چُولھے کا دھواں آہستہ آہستہ برآمدے میں پھیل رہا تھا۔ کالا سیاہ دھواں اس دھوئیں نے تو چھت کو سیاہ کر دیا تھا اور دیواریں بھی آہستہ آہستہ سیاہ ہو رہی تھیں۔ کیا اُس کا دل بھی ایک دن سیاہ ہو جائے گا اور روشنی کی کرن ہمیشہ کے لئے مفقود ہو جائیگی۔ ایک دن لڑکی کی ماں نے یہ تمام ماجرا دیکھ لیا۔ اُسی وقت وُہ لڑکی کو بالوں سے گھسیٹتی ہوئی نیچے لے گئی۔ اُس کے بعد اُس نے لڑکی کو کبھی تنہا نہ دیکھا جب کبھی وُہ قریب آتی تو اُس کے ساتھ کوئی نہ کوئی آدمی ضرور ہوتا۔ چند دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ لڑکی کو ہسٹریا ہو گیا ہے۔ وُہ رات بھر چلاتی رہتی تھی۔ لڑکی کی چیخیں اُسے سونے نہ دیتی تھیں۔ جب وُہ بستر پر لیٹ جاتا تو لڑکی کے سُرخ ہونٹ اُس کی آنکھوں

کے سامنے طواف کرتے، اور وہ دیر تک جاگتا رہتا اور پھر اُسے معلوم ہوا کہ لڑکی پاگل ہو گئی ہے، اور اب وہ برآمدے میں بیٹھ کر جب لڑکی کو کھڑکی میں کھڑا دیکھتا تو اسکے بدن پر کپکپی سی دوڑ جاتی۔ لڑکی کے چہرے پر ایک عجیب قسم کی مایوسی تھی۔ نہ وہ مسکراہٹ تھی، نہ وہ آنکھوں کی چمک۔ اب لب بھی سُرخ نہ تھے، وہ پیلے اور زرد ہو گئے تھے۔ وہ حیرت زدہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتی اور ہاتھ سے اشارے کرتی ان اشاروں کا کیا مطلب تھا۔ اب بھی وہ باتیں کرتی۔ کبھی کبھی یونہی ہنستی، پھر بالوں کو نوچنے لگتی اور جب بال نوچتے نوچتے تھک جاتی تو دھیمی آواز میں گنگنانے لگتی لیکن وہ شعریت کہاں گئی۔ وہ موسیقی کیوں مٹ گئی۔ زندگی کا سرچشمہ کیوں خشک ہو گیا پنجتارے کے پھول ابھی تک سُرخ تھے۔ آسمان بادلوں سے اسی طرح گھرا ہوا تھا۔ سُورج کی کرنیں اب بھی سرسبز پتّوں سے آنکھ مچولی کرتی تھیں۔ قدرت کا حُسن اُسی طرح قائم بالذات تھا۔ لیکن لڑکی کا حُسن فنا ہو چکا تھا۔

اس روح فرسا حادثے کے بعد اُس نے ساتھ والے گھر کی طرف نگاہ کی تھی۔ ساتھ والے گھر اور اُس کے درمیان صرف ایک دیوار تھی۔ دیوار کوئی خاص اُونچی نہ تھی۔ وہ اس دیوار کو بڑی آسانی سے پھاند سکتا تھا۔ لیکن پھاندنے کے لیئے اتنی ہمت نہ تھی۔ دیوار میں ایک چھوٹا سا سوراخ تھا، جس میں سے وہ ایک لڑکی کو دیکھا کرتا تھا اکثر جب صحن میں دھوپ آجاتی، سردیوں کی دھوپ بھی کتنی میٹھی اور پیاری ہوتی تھی وہ کپڑے اُتار کر اور ایک لنگوٹا پہن کر صحن میں آجاتا اور اپنے جسم پر سرسوں کے تیل کی مالش کرنے لگتا، کبھی کبھی لڑکی بھی اُسی سُوراخ سے اُسے دیکھنے لگتی، صرف وہ اُس کی

چمکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ سکتا تھا۔ اُن آنکھوں کی ہر حرکت سے آشنا ہو چکا تھا۔ پلکوں کی ہلکی سی جنبش، ابروؤں کے ہلکے کھنچاؤ سے وُہ لڑکی کے جذبات کو پڑھ سکتا تھا۔ کبھی کبھی وُہ ایڑیوں پر کھڑی ہو کر اُسے دیکھتی تو وُہ اُس کے رخساروں اور لبوں کو دیکھ لیتا، صرف ایک ثانئے کیلئے، صرف ایک لمحے کیلئے —— لڑکی کے لب حرکت کرتے۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا، جیسے بادلوں میں بجلی کوندی ہے۔ لڑکی کے لبوں کی جنبش اُس کی آنکھوں کی بے پناہ تڑپ، اُس کے رخساروں کی ہلکی سی چمک —— وُہ کبھی نہیں بھول سکتا اور پھر وُہ اپنے جسم پر زور زور سے تیل کی مالش کرنے لگتا کبھی کبھی وہی لڑکی ایک چھوٹے بچے کو اُٹھا کر سوراخ کے قریب آ جاتی اور بچے کو زور زور سے چومنے لگتی، وُہ بوسوں کی اس نازک لطیف لذت بھری آواز کو برداشت نہ کر سکتا تھا۔ وُہ چاہتا تھا کہ اس دیوار کو پھاند کر دوسری طرف چلا جائے اور لڑکی کو اپنی باہوں میں جکڑ کر اتنے زور سے چُومے کہ اُس کی روح کی بھوک اور تشنگی ہمیشہ کیلئے مٹ جائے۔ وُہ ہر روز یہی تہیّہ کرتا کہ وُہ آج ضرور دیوار پھاند کر دوسری طرف چلا جائیگا۔ لیکن یہ ارادہ ہمیشہ ارادہ ہی رہا۔ وُہ اُس پر کبھی عمل نہ کر سکا۔ حتیٰ کہ لڑکی کے والدین کو اس بات کا علم ہو گیا۔ اُنہوں نے لڑکی کو گاؤں میں بھیج دیا۔ چند ماہ بعد لڑکی کی شادی ہو گئی۔ اس بات کو آج دو سال ہو چکے ہیں۔ کبھی کبھی لڑکی میکے آتی ہے تو اُس کی گود میں ایک ہنستا ہوا، مسکراتا ہوا بچہ ہوتا ہے۔ وُہ اکثر لڑکی کی طرف گرسنہ نظروں سے دیکھتا ہے۔ لیکن اب لڑکی کی آنکھوں میں چمک پیدا نہیں ہوتی اُس کی آنکھیں ٹھہرے ہوئے تالاب کی طرح پُرسکون ہیں۔ اس کے ہونٹوں کی لرزش غائب ہو چکی ہے۔ وُہ چُپ چاپ اُس کے قریب سے گذر جاتی ہے، ایسا معلوم ہوتا،

جیسے وُہ اُسے بالکل نہیں پہچانتی اور آج کل اُس کے دائیں بائیں ایک افسردگی ہے ایک اُداسی ہے، ایک اجنبیّت ہے، جس کے احساس سے اُس کے ذہن میں ایک عجیب کیفیّت پیدا ہوگئی ہے۔

اب بھی وُہ کھڑکی کی طرف دیکھتا ہے۔ لیکن کھڑکی بند ہے، اب بھی وہ سُوراخ کی طرف نگاہ کرتا ہے۔ لیکن کسی کے لب اب جنبش نہیں کرتے۔ کسی کی آنکھیں اب نہیں مسکراتیں، کسی کی پلکیں اب اُس کے دل میں ارتعاش پیدا نہیں کرتیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی جامد ہے۔ غیر متحرک ہے۔ اُس کی ہر حرکت، ہر جنبش پر ایک اندھی طاقت، ایک اندھی قوّت نے قبضہ کر لیا ہے۔ ناچار اُس کی نگاہیں ان سُرخ سُرخ پھولوں کی طرف اُٹھ جاتی ہیں۔ اس ذہنی کشمکش، اس جنسی جمود نے اس کے دماغ پر ایک عجیب اثر ڈالا ہے۔ اب اُس کا ذہن زہر آلود ہو گیا ہے۔ اب بھی وُہ لڑکیوں کی طرف دیکھتا ہے۔ لیکن اب اُس کا دل زور زور سے نہیں دھڑکتا بلکہ اُسے لڑکیوں کو چھُونے کی تمنّا ہوتی ہے۔ وُہ ان لڑکیوں کے جسموں کو جی بھر کر دیکھنا چاہتا ہے۔ وُہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ ان لڑکیوں میں کیا ہے۔ کیوں نہ وُہ اِن لڑکیوں کے جسموں کو اپنے ہاتھ سے چھُو کر دیکھے۔ کیوں اُس کے ذہن پر ناقابلِ بیان بوجھ ہے، کیوں وُہ راتیں جاگ جاگ کر کاٹتا ہے۔ کیوں اُس کی آنکھوں کے سامنے کسی کے سُرخ ہونٹ پھڑکتے رہتے ہیں۔ کیوں کسی کی گرسنہ آنکھیں اُسے پریشان کرتی ہیں۔ کیوں کسی کی لڑکھڑاتی، اُونگھتی، غیر مسلسل چیخیں، شکست خوردہ سپاہیوں کی طرح اُس کے دماغ سے ٹکراتی ہیں اور اُسے قلبی اور ذہنی اذیت پہنچاتی ہیں۔ عورت اور

مرد میں اتنا تفاوت کیوں ہے اور وہ انہی باتوں سے اپنے دماغ کو پریشان کیا کرتا۔ اور لکڑی کی کرسی پر بیٹھکر سرخ سرخ پھولوں کی طرف دیکھا کرتا

آج آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوا ٹھنڈی اور یخ بستہ تھی۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی، ماحول میں ناقابل بیان تلخی تھی اور اُس کا نوکر چولھے میں آگ جلا رہا تھا اُس نے اپنے نوکر کو بُلایا۔ جس کا نام اُس نے جرنیل رکھ دیا تھا۔

"جرنیل"

"جی حضور"

"آج بہت سردی ہے"۔ اُس نے سانس کو ہوا میں چھوڑتے ہوئے کہا۔ اُسکی آنکھوں کے سامنے ہلکی سی دُھند چھا گئی۔

"آج برف پڑے گی"۔

"جی ہاں"۔

"آج بھی تم اُس کے گھر جاؤ گے"؟

"پوچھنے کی کیا ضرورت ہے، بابو صاحب"۔ جرنیل ہنس کر بولا۔

"کیا تم اُس کے خاوند سے نہیں ڈرتے"؟

"بالکل نہیں صاحب"۔

"وہ تمہیں جان سے مار دے گا"۔

"میں اُس کے گھر ایک سال سے جا رہا ہوں"۔

"کیا اُس کے خاوند نے تمہیں ایک بار بھی نہیں دیکھا"۔

ہوا کا ایک اور تیز جھونکا آیا۔ اُس نے رانوں کو زور سے دباتے ہوئے کہا:۔

"وُہ رات کو کہاں سوتی ہے؟"
"اپنے خاوند کے کمرے میں۔"
"تم اُسے کہاں ملتے ہو؟"
"اُسی کمرے میں"
"جھوٹ۔"
"بالکل ٹھیک ہے صاحب"
"کیا وُہ افیون کھا کر سوتا ہے؟"
"مجھے معلوم نہیں، میں صرف اپنی محبوبہ کے اشارے کا منتظر رہتا ہوں۔جب وُہ دروازہ کھولتی ہے تو میں بے دھڑک اندر چلا جاتا ہوں۔"
"تمہیں ڈر نہیں لگتا؟"
"بالکل نہیں۔"
"تم واقعی جرنیل ہو۔"

آسمان پہ بادل زیادہ گہرے ہو رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج برف ضرور پڑے گی، دُور پہاڑوں پر سفید دُھند چھائی ہوئی تھی اور آہستہ آہستہ چوٹیوں سے پھیلتی ہوئی پہاڑوں کے دامن میں پناہ گزین ہو رہی تھی۔جرنیل کی محبوبہ نے اُس کے دل و دماغ میں ایک عجیب جنونی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صبح کا ہر ذرہ بیدار ہو چکا ہے، یہ بیداری اچھی نہیں۔ اُس نے سوچا۔ وُہ نوکر کی طرف پُرمعنی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔کیا وُہ اس سے کہہ دے کہ ایک رات کے لئے وُہ اپنی محبوبہ کو اُس کے پاس بھیج دے، یہ کس طرح ہو سکتا ہے، شائد وُہ یہ بات سُن کر نوکری

چھوڑ دے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے، نہیں نہیں۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا اور وُہ دیر تک اس بات پر غور کرتا رہا کہ کسی کی آہٹ نے اُسے چونکا دیا۔

"جرنیل، دیکھو کون ہے۔"

"صاحب کوئی کتا ہو گا۔"

"دیکھو تو سہی۔"

پھر کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا

"اندر آجاؤ۔" جرنیل نے اُونچی آواز میں کہا۔

دروازہ کھلا۔ ایک عورت اندر داخل ہوئی۔ دالان سے گزرتی ہُوئی برآمدے میں آگئی اور پھر ستون کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ اُس نے عورت کو سر سے لیکر پاؤں تک دیکھا۔ اُس کے کپڑے جا بجا پھٹے ہوئے تھے۔ سر کے بال خاک آلود تھے۔ وُہ بارش سے بھیگ چُکے تھے اور اُن کی بہت سی لٹیں، کانوں اور رخساروں سے چپکی ہوئی تھیں۔

"کیوں کیا بات ہے؟" اُس نے تلخ لہجے میں کہا۔

"مَیں بھُوکی ہوں۔"

وُہ اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ چہرے کی جلد سفید تھی۔ اُسے کچھ ڈھارس ہُوئی

"کیا تم کام نہیں کر سکتیں، کافی ہٹی کٹی ہو اور پھر یوں ہاتھ پھیلا کر مانگ رہی ہو" اُس نے استہزا سے کہا۔

"بابو، کوئی کام ہو تو بتاؤ، مَیں کرنے کیلئے تیار ہوں۔" اُس نے برآمدے میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

اب وُہ اُس عورت کی طرف بغور دیکھنے لگا۔ عورت کی عمر اٹھارہ یا بیس برس کی ہو گی، گندے اور پھٹے ہوئے کپڑوں نے اُسے بدنما بنا دیا تھا۔ عورت کی آنکھیں خوبصورت تھیں، گو اُن آنکھوں میں حزن و ملال کی جھلک نمایاں تھی۔ لیکن اُس کی لانبی پلکیں اُس حزن و ملال کو چھپائے ہوئے تھیں۔ عورت کے خدوخال دلکش تھے۔ لیکن اُس کے ہونٹ پتلے اور سُوکھے ہوئے تھے۔ چہرہ بھرا ہوا تھا۔ لیکن ناک ستواں نہ تھی۔ رخساروں پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ صاف عیاں تھا کہ اس عورت نے ایک عرصے سے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا لیکن اب بھی رخساروں پر مٹتے ہوئے شباب کی رعنائی اور تازگی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ غربت اور بھُوک نے اس لڑکی کو قبل از وقت عورت بنا دیا ہے۔ لیکن اُس کے چہرے کی سپیدی میں بے پناہ کشش تھی۔ وُہ خاموش سی بُت بن کر اُس کی طرف دیکھنے لگی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ وُہ ایک خوفناک جنگل سے گذر کر ایک حسین سجے ہوئے کمرے میں داخل ہو گیا ہے۔ اب بادل سارے آسمان پر چھا گئے تھے، ہوا زیادہ سرد ہو چکی تھی۔ صرف ٹین کی چھت پر بارش گنگنا رہی تھی، اس آواز میں موسیقیت سی تھی جو اُس کے دل کی موسیقیت سے ہم آہنگ ہو رہی تھی۔

"جرنیل"

"جی"

"اس عورت کو گیہوں صاف کرنے کیلئے دو۔"

اور وُہ گیہوں صاف کرنے لگی۔ اُس نے کُرسی کو عورت کے نزدیک لاتے ہوئے کہا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"گلاب"۔ اُس نے گیہوں میں سے کنکر نکالتے ہوئے کہا۔

"تمہارا خاوند کہاں ہے ؟"

"وُہ مزدوری کرنے پنجاب چلا گیا ہے"۔

"کیا وُہ تمہیں روپے نہیں بھیجتا"؟

"کچھ بھی نہیں بھیجتا۔ بابو"۔

گلاب یہ کہکر جلدی جلدی چھاج میں گیہوں پھٹکنے لگی، اُس کی پلکیں جُھک گئیں اور اُس کے لبوں پر اُداسی کی لہر دوڑ گئی۔

"کہاں رہتی ہو گلاب"؟

"اُس دھند کے پیچھے"۔ اُس نے دور پہاڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

عورت کے لب پھر کانپے اور دزدیدہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

وُہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن پھر خاموش ہو گیا۔

"مزدوری کیا دوگے بابو"؟ گلاب کے لبوں کے کونوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھرنے لگی۔

"تمہیں کتنے روپوؤں کی ضرورت ہے"؟ یہ الفاظ کہکر اُس کا دل دھڑکنے لگا۔

اس سوال کے جواب پر اُس کی مسرت کا انحصار تھا۔

گلاب مسکرائی۔

اُس مسکراہٹ میں کیا کچھ نہ تھا۔ جیسے ساری کائنات سمٹ کر اُسی تبسم میں آ گئی ہے۔ اُس مسکراہٹ میں اپنی بے بسی، یاسیت، اپنی ناکام آرزوؤں، اپنی تلخ کامیوں کو چھلکتے ہوئے دیکھا، اب اُسے محسوس ہوا کہ اس عورت کے لب پھیکے اور سُوکھے نہیں ہیں بلکہ پھولوں کی طرح سرخ اور نرم و نازک ہیں، اُس لڑکی کے لبوں کی طرح، جو پاگل ہو چکی ہے۔ ان آنکھوں میں وہی چمک نمایاں ہے جو اُس نے ساتھ

والے گھر میں لڑکی کی آنکھوں میں دیکھی تھی۔ اس مسکراہٹ نے اُسے بے دست و پا کردیا۔ وُہ طوفان جو برسوں سے اُس کے سینے میں متلاطم تھا۔ آج سرخ لاوے کی طرح اُس کے جسم سے پھوٹ نکلا۔ اُس نے عورت کے سیاہ بالوں کی طرف دیکھا۔ اُن پر خاک جمی ہوئی تھی لیکن پھر بھی وُہ ان بالوں کو چھونا چاہتا تھا۔ اُس کی نگاہیں سیاہ بالوں سے ہوتی ہوئی، اُس کی سپید کھُلی پیشانی کو چھوتی ہوئی۔ اُس کی ناک، کان رخساروں اور لبوں کو مَس کرتی ہوئی اُس کے سینے کی طرف بڑھیں۔ وہاں ایک میلا سا پھٹا ہوا دوپٹہ پھیلا ہوا تھا، نگاہیں بڑھتی گئیں، پھیلتی گئیں، ذہن پر تاریکی چھاگئی۔ نرم و نازک غیر مرئی تاریکی —— پہاڑوں پر پھیلی ہوئی دُھند کیطرح —— بجلی کی لہر آنکھوں میں تڑپنے لگی۔ کان سرخ ہوگئے اور آنکھیں نہایت بیباکی سے کپکپاتی ہوئی اُس کی ٹانگوں کی طرف گئیں۔ شلوار جابجا پھٹی ہوئی تھی۔ اور عورت کی رانیں بے نقاب ہورہی تھیں، کتنی سفید جلد تھی، اور اُس جلد پر ہلکی نیلی سی لکیریں وُہ اس جلد کو چھونا چاہتا تھا۔ یہ سفیدی کیا ہے، اس گوشت میں کیا ہے۔ اگر وُہ اس گوشت کو چھُوئے تو وُہ کیا محسوس کرے گا؟ یہ سفید سفید لکیریں کدھر جاتی ہیں۔ وُہ سر سے لیکر پاؤں تک لرز گیا۔

"گلاب"۔

گلاب نے اُسکی طرف دیکھا، اُس کی آنکھیں مسکرائیں۔

"تمہیں کتنے روپوں کی ضرورت ہے؟"

"روپے"۔ گلاب نے چونک کر کہا جیسے کسی بھیانک خواب کو دیکھکر جاگی ہو۔

"ہاں"۔

"آٹھ آنے"۔

"میں تمہیں آٹھ آنے نہیں، بلکہ ایک روپیہ، دو روپے، تین روپے، چار روپے دونگا"۔ یہ کہہ کر وُہ رُک گیا۔

گلاب نے اُس کی طرف دیکھا۔

"اگر تم میری بات مان جاؤ"۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

گلاب نے نگاہیں نیچی کر لیں۔

"تم اندر آجاؤ"۔ یہ الفاظ وُہ جلدی سے کہہ گیا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی غیبی قوت اُس سے یہ الفاظ کہلوا رہی ہے۔ ایک ایسی غیبی قوت جسے وُہ پہچان نہیں سکتا۔ جس کی ہر جنبش اُس کے جسم میں آگ لگا رہی ہے۔ وُہ ایک ایسی لذت ایسی تعیش سے ہمکنار ہو رہا تھا جس کی گرانباری کا وُہ متحمل نہیں ہو سکتا۔ اسکی رُوح نے بچپن کے بوسیدہ کپڑوں کو اتار کر نیا قالب اختیار کر لیا تھا۔ وہ اپنی رُوح کی طاقت سے ایک ایسی چیز کی تخلیق کرے گا جو نہایت نرم، خوبصورت غیر فانی اور غیر محسوس ہونے والی ہوگی۔ اُس کے خون میں شعلے بھڑکنے لگے اور اُس کے خون میں شعلے بھڑکنے لگے اور اُس کے رخسار آتشیں ہو گئے ——— آہستہ آہستہ تاریکی پہاڑوں پر سے پھسلنے لگی۔ چوٹیوں سے پھسلتی ہوئی، جنگلوں میں سے گذرتی ہوئی، درختوں سے اٹھکیلیاں کرتی ہوئی، پتوں کو چومتی ہوئی نیچے کی طرف بڑھی۔ یہاں اب سبزہ ہی سبزہ تھا۔ نرم، ملائم، مخملیں گھاس! گھنے جنگل اب معدوم ہو رہے تھے! پہاڑ کے دامن میں کچھ سنگلاخ چٹانیں تھیں، جن کے قریب دریا آہستہ آہستہ بہہ رہا تھا۔ تاریکی سطح آب کو چھوتی ہوئی شہر کی طرف بڑھی، شہر کے مکانوں کو آغوش میں لیتی

ہوئی، تاریک اور گندی گلیوں سے گذرتی ہوئی پنجبارے کے درخت کی طرف بڑھی اور پھر اُس کے جسم کے اردگرد چھانے لگی، اُس نے محسوس کیا کہ اب اور کوئی راستہ نہیں اب مکمل اندھیرا ہو جائیگا اور پنجبارے کے پھول بھی اُس کی نظروں سے اوجھل ہو جائینگے یہ اذیت ناک سردی، یہ پھیلے ہوئے بادل یکایک تاریکی میں سما جائیں گے۔ بادل خاموشی سے بھاگے جا رہے تھے اور ٹھنڈی برفیلی ہوا اُس کے ہاتھوں کو چھوتی ہوئی آگے نکلتی جا رہی تھی اور اُسکی رگوں میں ایک نئی زندگی، ایک نئی لذت کا راگ موجزن تھا۔ وُہ دیر تک اپنے غیر فانی ہاتھوں سے گلاب کے جسم کو ٹٹولتا رہا۔ اُس کا ہاتھ اُس کی چھاتیوں سے ہوتا ہوا، اُس کے نرم، لچکیلے پیٹ کی طرف بڑھا اور پھر کولھوں کو چھوتا ہوا، اُس کی بھری ہوئی رانوں سے پھسلا، آج اُس کے دل میں ایک وحشی راگ موجزن تھا وُہ گلاب کی آنکھوں کی طرف دیکھنے لگا۔ گلاب کی آنکھیں بند تھیں۔ اُس نے گلاب کے لبوں کو چُوما، گلاب کے لب ٹھنڈے تھے اور اندر کی طرف بھنچے ہوتے تھے۔ یکایک وُہ ٹھٹک کر پرے ہو گیا۔

"گلاب"۔ اُس نے تھرّائی ہوئی مایوس آواز میں کہا۔

"بابو"۔ اور گلاب کی آنکھیں جُھک گئیں اور گلاب کے لب پھر ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے۔

اُس وقت اُسے ایسا محسوس ہوا کہ گلاب کا جسم ٹھنڈا ہے۔ برف کی طرح بالکل سرد اور یخ بستہ۔ اس ٹھنڈے لمس نے اُس کے ذہن کو بیدار کر دیا، گلاب کے برفیلے احساس نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ گلاب بستر پر ننگی لیٹی ہوئی تھی، جیسے وہ کہہ رہی تھی، جو کچھ کرنا ہے کر لو، مجھے اس کام سے کوئی سروکار نہیں، کوئی واسطہ

نہیں۔ لیکن میں انکار بھی نہیں کرتی۔ یہ عجیب بات ہے کہ کسی کام سے کوئی تعلق
بھی نہیں، واسطہ بھی نہیں اور پھر کسی بات سے انکار بھی نہیں لیکن جس بات نے
اُس کے ذہن کو بیدار کیا۔ وُہ عورت کا سرد لمس تھا۔ کیا عورت کا جسم سرد ہوتا ہے
اُس نے زندگی میں پہلی بار کسی عورت کو چھوا تھا۔ لیکن کتنا تلخ تجربہ تھا۔ اُس کا جسم
کیوں انگاروں کی طرح جل رہا تھا۔ اُسے اپنے آپ پر غصّہ آیا۔ اس ننگی عورت پر غصّہ
آیا جس نے اُس کے تخیل کو پارہ پارہ کر دیا تھا۔ بھلا اس میں گھبرانے کی کیا بات
ہے۔ نہایت سیدھی سادھی بات ہے، بات کیا ہے، وُہ سوچنے لگا، کچھ بھی نہیں۔
یہ عورت کیوں لیٹی ہوئی ہے اور تم کیا سوچ رہے ہو، اس کمرے میں اندھیرا کیوں ہے
یہ میلے اور بوسیدہ کپڑے کس کے ہیں۔ ان میں سے کیوں بدبُو آ رہی ہے۔ اب
اُسے اس اندھیرے میں کمرے کی ہر چیز نظر آنے لگی۔ الماریاں کھُلی پڑی تھیں۔ اُن
میں صرف ادویات کی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں، ایک کونے میں تین چار ٹرنک پڑے
ہوئے تھے۔ دوسرے کونے میں گھی کا ٹین رکھا ہوا تھا، کیا یہ ہسپتال ہے۔ کیا یہ
دوکان ہے، جہاں گھی فروخت کیا جاتا ہے۔ کیا وُہ گھی خریدنے آیا ہے بالکل نہیں
وُہ ایک عورت کے قریب بیٹھا ہوا ہے، یہ عورت کیوں لیٹی ہوئی ہے۔ یونہی چپ چاپ
خاموش۔ اُداس۔ یہ بولتی کیوں نہیں، یہ تو کچھ بھی نہیں کہتی، یہاں سے چلی کیوں نہیں
جاتی۔ اس کمرے میں یہ عورت کس طرح آئی۔ اس کمرے میں یہ ٹرنک کس نے رکھے،
چھت پر کس نے رکھے، چھت پر کس نے جالے بنے۔ مکھیاں کیوں جالوں میں پھنس
جاتی ہیں۔ اُس کا ہاتھ لحاف پر جا پڑا۔ ہاں یہ لحاف ہے۔ اُس کے حواس درست
ہیں۔ وُہ ابھی تک پاگل نہیں ہوا۔ یہ تکیہ ہے۔ یہ چادر ہے، اس غلاف پر کس نے

بیل بوٹے کاڑھے ہیں۔ یہ عورت جاتی کیوں نہیں، کیا وُہ اس عورت سے کہدے کہ وُہ چلی جائے، وُہ خود بخود چلی جائے گی، کہاں۔ جدھر اُس کا گھر ہے۔ مگر یہ تو بستر پہ بے جان ساکت اور غیر متحرک ہو کر رہ گئی ہے، جیسے یہی اُس کا گھر ہے، کیا وُہ اس عورت کو گھر میں رکھ لے، ان ٹرنکوں کی طرح، ان بوتلوں کی طرح، اس چھتری کی طرح، —— کیا یہ عورت ایک چادر ہے، ایک غلاف ہے، ایک ٹرنک ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ عورت جاتی کیوں نہیں، اُس نے نفرت کے احساسات سے مغلوب ہو کر اپنے دل سے پوچھا یہ سوال بار بار اُس کے دماغ میں گھومنے لگا۔ پھر اُسے خیال آیا کہ اس عورت کو کچھ دینا چاہیئے۔ اُس نے دو روپے عورت کے ہاتھ پر رکھے۔

گلاب چلی گئی۔

اور وُہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ کمرے سے باہر نکل کر اُسے محسوس ہونے لگا کہ ابھی تک اُس کے رُخسار آتشیں تھے، ابھی تک اُس کے جسم میں سے شعلے اُٹھ رہے تھے اُس کی حالت اُس بھوکے درندے کی طرح تھی جسے گوشت تو دکھایا جائے۔ لیکن کھانے کو کچھ نہ دیا جائے۔ اس حالت میں بھوک اور بڑھتی ہے گھٹتی نہیں۔ اب بھی اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ وُہ آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ بہت آگے، وُہ دور جانا چاہتا تھا بہت دُور —— جہاں ایک نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ گلاب کے برہنہ جسم نے اُسکے اندر جنونی کیفیت پیدا کر دی تھی، جس سے وُہ رہائی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وُہ اس اندھیرے سے نجات پانا چاہتا تھا۔ وُہ اس زہر کو اُگل دینا چاہتا تھا۔ آج کے واقعہ نے اُس کے ذہن اور تخیل کو جہنمی بنا دیا تھا۔ وُہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ برف پڑ رہی تھی۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ لاکھوں روئی کے گالے ستاروں کی طرح گر رہے تھے۔ وُہ

پنجتارے کے درخت کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ برف اُس کے تپتے ہوئے جسم پر پڑنے لگی، اُس کے سر پر، اُس کے کانوں پر، اُس کے کندھوں پر، اُس کے پاؤں پر برف پڑتی گئی۔ ٹھنڈی اور یخ بستہ! —— ہر طرف پراسرار سکوت تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی، صرف برف پڑ رہی تھی۔ آسمان پر سپیدی ہی سپیدی تھی۔ ٹین کی چھتیں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں، پنجتارے کے پھول برف میں ملفوف ہو گئے تھے اور بالکل سفید دکھائی دیتے تھے۔ چاندی کے اُن آویزوں کی طرح، جو کسی خوبصورت عورت کے کانوں میں لٹکے ہوئے ہوں۔ صرف ایک چڑیا اپنے پروں کو سکیڑتی ہوئی ایک شاخ سے دوسری شاخ تک چلی گئی، آہستہ آہستہ برف پڑ رہی تھی، خاموش۔ اُداس بے جان —— بے کیف برف —— اُس کے دل کی حرکت اب کمزور ہو چکی تھی۔ اُس کے جسم کا طوفان، وہ غوغائے عظیم، اب برف کی طرح سرد ہو رہا تھا اور اُس کی حالت اُس چشمے کی طرح تھی۔ جس کا تمام پانی یکایک سوکھ جائے، یا جیسے کوئی گونج فضا کی پہنائیوں میں آہستہ آہستہ جذب ہو جائے —— اب وہ صرف برف کو دیکھ سکتا تھا۔ سپید سپید برف ٹھنڈی اور یخ بستہ برف —— اور کچھ نہیں!